



۷۸۶

۹۲۱۱۰

یا صاحب الزماں اور کئی



لبیک یا حسینؑ

نذر عباس
خصوصی تعاون: رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری -

SABEEL-E-SAKINA

Unit#8,

Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.

www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL USE

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

الغمام

حصہ اول

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب
المُرْتَضٰے کا مسکت جواب

فروغ کاظمی



ایکسپریس

اس مظلوم شہزادے کے نام

جو ضربِ عمری کا شکار لھو کر

بطنِ مادرِ لہر میں شہید ہو گیا

فروغِ کاظمی

جُمْلَہ حُقُوقِ بَہ حَقِّ مُؤَلَّفِ وَ نَاشِرِ حِفْظِ هِیْنَ

نام کتاب: _____
مؤلف: _____
تعداد اشاعت: _____
سن اشاعت: _____
طباع: _____
قیمت: _____
ناشر: _____

ملنے کا پتہ

عباس بک ایجنسی

درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ ۳

فون دوکان: — 260756 فون رہائش گاہ:

269598

اندکس

صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات
۳۴	پیشہ	۱	پیش لفظ
۴۴	نفع خوری	۹	اہم گفتگو
۴۴	شراب نوشی		
۴۴	ابوبکر کا مسلمان ہونا		باب اول - ابوبکر بن تمیم
۵۱	صدیق اکبر کون ؟		
۵۲	ابوبکرؓ پیغمبر اسلام کی نظر میں	۳۰	شجرہ
۵۳	ابوبکر کا شیطانی ایمان	۳۱	قریش کون ؟
۵۵	ابوبکر کی نافرمانی اور خدا کی لعنت	۳۷	ابوبکر خلیفہ تھے یا خالف !
۵۸	ابوبکر کی معزولی	۳۷	پیدائش
۶۱	غارِ ثور میں ابوبکر کا گریہ	۳۸	ابوبکر کی وجہ تسمیہ اور نام
۶۷	غارِ ثور کی نوعیت	۳۹	حلیہ
۶۷	غزوات سے کنارہ کشی اور فرار	۳۹	ابتدائی زندگی
۶۹	جنگ بدر	۴۰	والدین
۷۱	جنگ احد	۴۰	تعلیم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ
عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ وَإِلَى الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ

آبائے

اس
کتاب کی

تالیف کا مقصد
کسی مسلمان کی دل آزاری نہیں

بلکہ

میرے مخاطب

صرف ابوالحسن ندوی اور وہابی مسالک افراد ہیں

اور

میری یہ کتاب

مولانا ندوی کی کتاب المرتضیٰ کے جواب میں ہو۔

فروغ کاظمی

پیش لفظ

(ایک فاضل مقالہ نگار کے قلم سے)

زور حق بھی کیا چیز ہے جو باطل کے قدم جھٹے نہیں دیتا۔ یہ قدرت حق دیکھیے کہ حکومت شام کے ہزاروں اور لاکھوں درہم و دینار حدیثوں کے بنانے پر مصروف ہو گئے۔ لیکن وہ درہم و دینار اس بات کو کسی طرح چھپانہ سکے کہ یہ حدیثیں حکومت شام کے کہنے سے بنائی گئی ہیں۔ اس پردہ کو چاک کرنے کے لیے فقراے ملت اسلامیہ کو ایک پیسہ بھی صرف کرنے کی ضرورت نہ ہوئی بلکہ وہ خود فخر تحقیق کے سامنے جامہ کتان کی طرح تار تار ہو گیا۔ ورنہ ابوعلی مدائنی جیسے شخص سے لکھوا دینے والی شے وہ انعام و اکرام نہ تھا بلکہ وہ زور حق تھا جسے بغیر ظاہر کیے ہوئے دل صبر نہ کر سکا۔ ورنہ احکام و اقوال خدا و رسولؐ کے بدل دینے میں ذرہ برابر بھی نہ حاکم شام کو کوئی باک تھا نہ اس کے ماننے والوں کو اس کی کوئی پروا تھی۔ اور زمانہ کتنا متدینین اہل اسلام سے پاک و صاف ہو گیا تھا کہ تعمیل حاکم شام مال و زر کی لالچ میں فوراً کی جاتی تھی چاہے قرآن محو ہو جائے یا حدیث رسولؐ حکومت نے دماغوں پر اتنا تسلط قائم کر لیا تھا کہ لوگوں کو بدھ اور جمعہ میں امتیاز نہ رہا تھا۔ اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ علی کون ہیں فاطمہ کون ہیں رسول کون ہیں اور ان کا آپس میں ایک دوسرے سے رشتہ

۷۲	باب ثانی	جنگ خندق
۷۵		جنگ خیبر
۷۹	بنی ہاشم	جنگ حنین
۸۱	حضرت عبدالطلبؑ	صلح حدیبیہ اور ابوبکر کی گالیاں
۸۳	حضرت ابوطالبؑ	ابوبکر سے رسول اللہؐ کی بیزاری
۸۴	حضرت طالبؑ	رسول اللہؐ کی شہادت
۹۲	مولود کعبہ حضرت علی علیہ السلام	سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت
۹۴		سقیفہ کی کارروائی
۹۷	باب ثالث - عمر بن الخطاب	خلیفہ کی ضرورت اور تقرری
۱۰۳	پیدائش	دھما چوکڑی
۱۰۴	نام، کنیت اور القاب	خالد بن ولید کے مظالم
۱۰۷	حلیہ	فدک پر قبضہ
۱۱۰	والدین اور نسب	فدک کی حقیقت
۱۱۵	ابتدائی حالات	ابوبکر سے سیدہ فاطمہؑ کی ناراضگی
۱۲۰	تعلیم و نگین مزاجی پہلوانی اور شہر آشوب	سیدہ کوئین حضرت فاطمہؑ زہراؑ کی ولادت
۱۲۳	پیشہ	حضرت فاطمہؑ زہراؑ پیغمبر اسلامؐ کی نظر میں
۱۲۵	حضرت عمر کا ڈرامائی اسلام	خلافت کی واپسی
۱۲۷	عمری نوشتہ	واقعہ قرطاس
۱۳۱	دوسرا خط	انتقال
۱۳۱	بت پرستی	مدفن
۱۳۳	حضرت عمر اور ام کلثوم	حضرت علیؑ کی خاموشی اور اپنے لیے تلوار نہ اٹھانے کا سبب
۲۱۱	کتابیات	

واجب الاحترام صحابی وہ سمجھا جاتا تھا جو آل محمد سے عداوت شدیدہ رکھتا ہو جو آل محمد سے جتنا قریب تھا وہ دنیا کی نظروں میں اتنا ہی ذلیل و کم وقعت والا تھا۔

ابو الصلت ہروی جو حضرت امام رضا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ممتاز ترین صحابیوں میں سے تھے ان کے متعلق امام ذہبی نے اپنی کتاب میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ رجل صالح الا انه شیعہ۔ یہ تھے تو مرد صالح و نیکو کا ضرور مگر ایک عیب یہ تھا کہ یہ شیعہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی اچھائیاں تھیں، جتنی خوبیاں تھیں، جتنے محامد و محاسن تھے، جتنے فضائل و مناقب تھے وہ سب ایک شیعہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو گئے۔

محمد بن ابوبکر جوام المومنین عائشہ کے سگے بھائی تھے جب ان کی بہن ام المومنین (تمام مومنین کی ماں) ہو سکتی ہیں تو ماں کا بھائی مامول ہی تو ہوتا ہے اس رشتہ سے محمد بن ابوبکر کو خال المومنین (تمام مومنین کا مامول) کہنا چاہیے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس لقب کے لیے معاویہ ابن ابوسفیان کا انتخاب ہوا۔ اس لیے کہ محمد بن ابوبکر کے دل میں امیر المومنین کی محبت جاگزیں تھی اور معاویہ کے دل میں عداوت۔ لہذا صاحب عداوت کو صاحب محبت پر ترجیح دی گئی۔

عمر بن سعد کو دنیا جانتی ہے کہ کیسا دشمن اہل بیت اور قاتل سردار جوانان جنت گزرا ہے مگر اس کے لیے ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب تقریب التہذیب میں لکھتا ہے کہ عمر بن سعد بن ابی وقاص المدنی فزیل الکوفۃ صدوق و لكن مقترا الناس لكونه اميرا على الجيش الذين قتلوا الحسين بن علي۔ عمر بن سعد بن ابی وقاص مدینہ کا رہنے والا دار و حال کو فہم بہت زیادہ سچا ہے لیکن لوگ اس کو اس سبب سے دشمن رکھتے ہیں کہ یہ اس لشکر کا

کیا ہے؟ علامہ مسعودی اپنی کتاب مروج الذهب میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے حضرت ابوبکر و عمر و معاویہ و علی کے بارے میں بحث کرتے تھے کہ وہیں ایک بوڑھا شامی بھی آپہنچا جس کی ڈاڑھی بڑی تھی اور ان لوگوں سے کہا کہ اب تک تم لوگ علی اور معاویہ کے بارے میں بحث کرتے رہو گے۔ ایک شخص نے اس سے کہا اچھا تم ہی بتاؤ تم ان لوگوں کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ اس بوڑھے نے پوچھا کس کے متعلق سوال کرتے ہو۔ اس شخص نے کہا علی ہی کے بارے میں بتاؤ کہ تم کیا کہتے ہو۔ اس بوڑھے شامی نے کہا وہی علی جو فاطمہ کے باپ تھے؟ اس شخص نے پوچھا فاطمہ کون تھیں۔ اس شامی نے کہا تھیں کون حضرت رسول خدا کی بیوی اور عائشہ کی بیٹی تھیں اور عائشہ معاویہ کی بہن تھیں۔ تب اس نے پوچھا کہ پھر علی کا کیا ہوا۔ اس شامی نے کہا وہ تو حضرت رسول خدا کے سامنے غزوہ حنین میں شہید ہو گئے (مروج الذهب ج ۲ ص ۱۰۸ بر حاشیہ کامل)

حکومت شام دماغوں پر اتنی چھا چکی تھی کہ لوگوں کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ خانہ کعبہ کسی عمارت کا نام ہے یا کسی انسان کا (مروج الذهب) وضع احادیث کا ایک کارخانہ تھا جس میں ضرورت کے مطابق حدیثیں ڈھالی جاتی تھیں۔ اگر کسی کو کبوتر بازی کا شوق ہوا تو حدیث رسول موجود اور اگر پیاز کی خرید و فروخت میں کمی پیدا ہو گئی اور ذخیرہ سڑنے لگنے لگا تو حدیث رسول وضع کر لی گئی۔ باپ کی مستعمل کنیز پر اگر بیٹے نے تصرف کرنا چاہا تو مفتیان شرع متین نے مال و زر کے ڈھیر دیکھ کر فتویٰ دے دیا کہ ہر دعویٰ کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے کنیز سے کہو کہ اس موقع کے دو گواہ پیش کرے تو دعویٰ قابل قبول ہے ورنہ تم کو تصرف کا حق حاصل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ گواہ پیش کر سکی نہ تصرف سے محفوظ رہ سکی۔ دین کو اس طرح سے برباد اور شریعت کو اس طرح سے پامال کیا جا رہا تھا۔

سردار تھا جس نے حسینؑ ابن علیؑ کو قتل کیا ہے۔ اس عبارت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیا عمر سعد کو دشمن رکھتی ہے لیکن ابن حجر اس کو دوست رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک قتل حسینؑ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس جگہ سے یہ راز بھی سمجھنے چلیے کہ تمام صحاح ستہ میں صحیح بخاری سب سے زیادہ مستند اور معتبر کیوں سمجھی جاتی ہے۔ اس کا راز یہی ہے کہ یہ کتاب دشمنان آل محمدؐ کو کام میں لاکر لکھی گئی ہے۔ اس کے راوی زیادہ تر وہی ہیں جو اہل بیتؑ اہل عداوت شدیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً مروان بن حکم۔ ابن حجر نے مروان کے لیے لکھا ہے کہ لایثبت لہ صحبتہ۔ اس کا صحابی ہونا ثابت نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے مروان اور اس کے باپ حکم کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا تھا جس کو مسعودی نے مروج الذهب میں ان الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ مروان ہو طرید رسول اللہ الذی غریبہ عن المدینہ ونفاک عن جوارہ۔ یعنی مروان رسول اللہؐ کا مطرود ہے جس کو آنحضرتؐ نے مدینہ سے باہر نکال دیا تھا اور اس کو اپنے پڑوس سے دور فرما دیا تھا۔ مروان آنحضرتؐ کے نزدیک قابل لعنت تھا۔ چنانچہ خود ام المومنین نے ایک مخاطبہ میں مروان سے کہا ہے کہ اما انت یا مروان فاشھا ان رسول اللہ لعن اباک وانت فی صلبہ۔ لیکن تو اسے مروان! تو میں شہادت دیتی ہوں کہ پیغمبرؐ نے تیرے باپ پر اس وقت لعنت کی جب تو اس کے صلب میں موجود تھا۔ حضرت امیر المومنین اس کو ایک یہودی نما ملما سمجھتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنی کتاب فتاوائے عزیزیہ صفحہ ۱۹۳ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مروان را لعنت کردن از لوازم سنت و محبت اہل بیت اس از جملہ فرائض ایمان است۔ مروان پر لعنت کرنا سنت اور محبت اہل بیت

لوازمات میں سے ہے جو منجملہ فرائض ایمان ہے۔

ایسے راوی سے امام بخاری نے روایت لی ہے۔ دیکھیے بخاری جلد اول، کتاب الہیہ باب ۱۶۳۔ حدیث نمبر ۲۴۲۲۔ باب مناقب زبیر بن عوام حدیث نمبر ۹۱۱ جلد دوم۔

دوسرا راوی عمران بن حطان ہے۔ یہ وہ راہ دین کا شناختہ راہ زن ہے جس نے اس ضربت کی تعریف کی ہے جو ابن طلحہ مرادی ملعون نے حضرت امیر المومنینؑ کے سر اقدس پر لگائی تھی۔ چنانچہ عمران بن حطان کہتا ہے یا ضریۃ من قتی ما اراد بها الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا انی لا ذکرک یوما فاحسبہ اوفی البریۃ عند اللہ میزانا (اصابہ ابن حجر مطبوعہ مکتبہ جلد ۳ ص ۳۵۴ و حیوۃ الحيوان دمری تحت لغت انسان)

یہ ضربت ایک متقی و پرہیزگار کے ہاتھ کی لگائی ہوئی ضربت تھی جو اس لیے لگائی گئی تھی کہ صاحب عرش اس سے راضی و خوشنود ہو۔ جب کبھی میں اس ضربت کو یاد کرتا ہوں تو یہ گمان کرتا ہوں کہ میزان عمل میں اس سے بڑھ کر کوئی وزن عمل نہ ہوگا اب ہر مسلمان ذرا سوچے کہ کیا عمران بن حطان صفت رواۃ میں شامل ہونے کے قابل ہے کیا اس لائق ہے کہ اس کی روایتوں پر اعتبار کیا جائے۔ مگر امام بخاری نے اس سے روایت لی ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری جلد ۳ حدیث نمبر ۷۸۱۔

اسی طرح سے ایک راوی حریر بن عثمان ہے جو حضرت امیر المومنینؑ سے اتنی عداوت رکھتا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کے بارے میں یہ حدیث جو ارشاد فرمائی ہے کہ علی بمنزلۃ ہارون موسیٰ (علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی) تو حدیث تو صحیح ہے لیکن سننے والوں کو دھوکا

کے لیے جھنجھنے نہیں دیے۔ دست و پا قطع کر دیے گئے۔ زبانیں کاٹ دی گئیں، سولی پر چڑھا دیے گئے، قید خانوں میں قید کر دیے گئے لیکن سوائے کلمہ حق کے دوسری بات زبان سے نہ نکلی۔ زمانہ ماضی سے یہی ڈھرا چلا آ رہا تھا۔ ابطال باطل لکھی گئی تو اس کا جواب احقاق الحق کی شکل میں سامنے آیا۔ عزیز مصر تعصب نے دہلی کے گندے نالے سے ایک بدبودار تحفہ شیعوں کو بھیجا تو یوسف کنگان دہلی نے بھی اس کا جواب نزہہ اثنا عشریہ کے نام سے دیا۔ شوکت عمر یہ شائع ہوئی تو اس کا جواب ضرب حیدریہ کے نام سے دیا گیا۔ قیقاہ لکھی گئی تو اس کا جواب کتاب سے دیا گیا۔ سیف قاطع وجود میں آئی تو برق لامع نے چوندھیا دیا۔ موجودہ دور میں انھیں خرافات کا ایک مجموعہ المرتضیٰ کے نام سے شائع ہوا جس میں حقائق کو چھپانے اور معارف پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ وہی راستہ اختیار کیا گیا ہے جو اسلاف کا تھا۔ انھیں نشانات پر چلنے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلاف قائم کر گئے تھے۔ یقین تھا کہ یہ حرف آخر ہے اور ہماری بات کا جواب دینے والا کون ہے؟ مگر مشہور ہے ہر فرعون نے راموسی۔ ابھی زمانہ کا دامن ایسے افراد سے خالی نہیں ہے کہ باطل حملہ آور ہوتا رہے اور وہ خاموش بیٹھے رہیں۔ حقائق و معارف پامال ہوتے رہیں اور وہ دیکھتے رہیں۔ حق پر آج آئے اور ان کا احساس و شعور بیدار نہ ہو۔ اس خدمت کے لیے خالق نے فروغ کاظمی کا انتخاب کیا جو محض شاعری نہیں بھر تحقیق و تدقیق کے خواص بھی ہیں۔ میدان مناظرہ کے مجاہد اعظم بھی درجائے معرفت کے شاعر بھی۔ جو ہمیشہ زبان سے احقاق حق اور قلم سے ابطال باطل کرتے رہے۔ کمال شاعری جن کے ذہن رسا کی ایک فکر نارسا کا نام ہے۔ اگر نظم کی لڑیاں ان کے تار نفس کے حرکات کا دم بھرتی ہیں تو نشر کے موتی ان کے صدق ذہن کے تبسم کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کی عارفانہ طبیعت اس کو برداشت نہ کر سکی

ہوا ہے۔ پیغمبر نے یہ فرمایا تھا قارون من موسیٰ علیٰ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو قارون کو موسیٰ سے تھی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۳۹)

ایک راوی اشعث بن قیس ہیں۔ یہ بھی حضرت امیر المومنینؑ کے قتل کی سازش میں شریک تھے (تذکرہ خواص الامہ) ان کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی اہل بیت کی دشمنی میں شہرہ آفاق تھے۔ لڑکا محمد بن اشعث جو ابن زیاد کے یہاں سے جناب مسلم کے قتل کے لیے فوج لے کر آیا تھا اور لڑکی جعدہ بنت اشعث جس نے حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کیا۔

غرض کہ جو بھی اٹھا اس نے دامن درمے درمے سخن اہل بیت اطہار کی دشمنی میں پورا زور صرف کر دیا۔

”امیر شام کی شومی قسمت خوں آشامیوں کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ بنی امیہ کی اُمت اس دولت و اہمیت سمیت اسی رویہ پر گزر گئی بنی عباس اس دن سے بلبرواہ ہو کے جس کے لیے خدائی اعلان تھا ”یومنا عجبو ساقمطیرا“ اپنے اساس دولت کو وقار اہل بیتؑ کے مقابلے میں مضبوط کرتے رہے۔ مسلم نے اپنی اسلام نوا زبیاں غلط انداز سے صحیح کیں۔ بخاری نے اپنی کتاب کو وزارت قرآن سپرد کر کے دل کا بخار اچھی طرح نکالا۔ ابن ماجہ کے توج نے سفینہ فضل اہل بیتؑ کو متلاطم کر دیا۔ ابو داؤد نے اپنی کوششوں سے دولت و سلطنت کا دل اپنے لیے موم کر لیا۔ مشکوٰۃ نے الہی چراغ کے مقابل میں اپنے چراغ پیش کیے۔ ابن حجر نے ”تطہیر الجنان“ میں اپنی ننگ دلی کو اچھی طرح سراہا ہے

غرض کہ جو آیادہ اقوال خدا و رسول سے جہاد کرتا ہوا آیا لیکن ہر دور میں وہ حق کو اور حق پرست بھی دنیا میں موجود رہے جنھوں نے باطل کے قدم ایک ساعت

اہم گفتگو

اسلام میں جاگیر داری کی بدعت جاری کرنے والے حضرت عثمان تھے اور ان کے بعد اس بدعت کی غیبت رسم کو ترقی اور وسعت دینے والے امیر شام معاویہ تھے اور اسی بدعت نے ہر ایک دور، ہر عہد اور ہر زمانے میں صورت بدل بدل کر اسلام کو تباہ اور مسلمانوں کو برباد کیا۔ کبھی اس نے شیرازہ اسلامی کو منتشر کیا تو کبھی جذبہ اسلامی کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور سچی عمل پیہم (جو بجائے خود ایک ظلم عظیم ہے) بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد میں جاری رہا۔ البتہ بدلتے ہوئے دور اور حالات میں تغیرات کے تقاضوں نے مختلف نام اختیار کیے مگر ملوکیت وہی رہی۔ کوئی اسلام کے اولین دور کے سازشی مسلم حکمران کی صورت میں سامنے آیا، کوئی مسلم ڈکٹیٹر کے روپ میں ابھرا، کہیں امارت کے نام سے خانہ ساز خلافت چلائی گئی اور کہیں شاہی کے نام سے پرانی استبدادیت کو جاری رکھا گیا۔ اسی سازشی ملوکیت، امارت، ڈکٹیٹر شپ، شاہی اور شہنشاہی کے ساتھ درباریت اور جاگیر داری نے موقع محل اور وقت مقام کے لحاظ سے مختلف صورتیں بدل بدل کر اپنے وجود کو باقی رکھا اور اسی کے ناجائز ملکدوں پر پلنے والے خوشامدی، درباری، جاگیر دار، عہدہ دار، ایمان فروش مورخ، قاضی، ملا، مفتی، راوی اور ضمیر فروش امراء اور علماء تھے، اور آج بھی موجود ہیں۔ اور سچی لوگ اسلام کو، مسلمانوں کو بلکہ پوری ملت مسلمہ کو تباہ و برباد کرنے میں ہمیشہ

کہ باطل حملہ آور ہو اور وہ خاموش رہیں۔ لہذا فروغ کاظمی اپنے میٹھی کودار اور بوذری گفتار کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور رات و دن کی مسلسل محنت شاقہ کے بعد زیر نظر مجموعہ مرتب کر کے پیش کر دیا۔ اور باطل کے چہرہ پر وہ طمانچہ رسید کیا ہے کہ قیامت تک وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

نقطہ
گدائے باب اہل بیت
ایک مقالہ نگار

۲۵/۱۰/۱۴۲۸ھ
۲۵/۱۰/۱۴۲۸ھ

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی میرے ہم وطن اور نظریاتی اختلافات کے باوجود میرے بھائی ہیں (یہ اور بات ہے کہ مولانا ندوی صاحب کا دیرینہ تعلق ندوہ سے ہے اور دارالندوہ وہ جگہ ہے جہاں کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں مولانا ندوی کی کتاب المرتضیٰ ص ۵۵۴) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مولانا کا قلم، قسطاس کی دادیوں میں بے نیل اونٹ کی طرح بلبلا تا پھرے اور میں تماشا نیوں کی صف میں کھڑا ہو کہ اس بے راہ روی کا تماشا دیکھوں۔

میرا شیوہ حق پرستی اور دنیا حق فروش

میں کہاں لے جاؤں اپنے مٹھی کردار کو (مولف)

مولانا ندوی صاحب کے رشحات قلم کا دل آزار نتیجہ اور حالیہ تالیف "المرتضیٰ" میرے ایک مخلص دوست اور کرم فرما جناب ید انتخاب حسین صاحب کاظمی نے مجھے مرحمت فرمائی، جس کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا ندوی نے سیرت علوی کو سپر ہناک اسلام کی ان نزاعی شخصیتوں کا دفاع کیا ہے جو چودہ سو برس سے اختلافی ہیں اور جن کے غیر اسلامی طرز عمل نے اسلام کو پارہ پارہ کر کے مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا، یا یوں کہا جائے کہ فاضل مولف نے محض اپنے مخصوص نظریات کی وضاحت کے لیے سیرت علوی کو بہانہ بنا کر نہ یہ کہ صرف خلفائے ثلاثہ کی شان میں مدح کے گیت گائے ہیں بلکہ خانوادہ رسالت پر وہابیت کا کیچڑ اچھالنے میں اپنی ذہنیت، کوتاہ بینی اور تاریخی بددیانتی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ جس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۵۔ بنی ہاشم ایک زمانہ تک اپنی قوم و ہم وطن کے عقائد جاہلیت اور غیر اللہ کی عبادت میں ان کے شریک ہو گئے تھے۔ (المرتضیٰ ص ۳۱-۳۲)

پیش پیش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاسق درباریوں اور جاگیرداروں اور فاجر امراء و علماء کی جانب سے ہمیشہ خالص اسلامی تحریکوں کی مخالفت کی جاتی رہی اور آج بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی خباثت کی بدلی ہوئی ترقی یافتہ شکل فیصل ایوارڈ ہے جو ایک لاکھ سعودی ریال پر مشتمل ہے اور جسے حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کے ساتھ حق کو باطل کا لباس پہنانا پڑتا ہے اور مشقت سے اسلام کی خوبصورت تصویر پر وہابیت کی مکروہ تصویر بنانا پڑتی ہے اور اس کام کو بڑی جانفشانی کے ساتھ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے انجام دیا ہے اور ایسے کامیاب انداز میں انجام دیا کہ فیصل ایوارڈ حاصل کر لیا۔ اسی ایوارڈ نے ندوی صاحب کو نہ صرف دولت و شہرت کا مالک بنایا بلکہ ان کے نام و نمود کے تسلسل کو بھی باقی رکھا۔

ندوی صاحب سعودی اخراجات سے جو بھل قسم کی کتابیں یا رسائل شائع فرماتے ہیں، ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا اسلام محض ایک دکھاوا اور غلوں و عقیدت سے عاری ہے۔ اگر ندوی صاحب کے دل و دماغ میں حقیقی اسلام کی کوئی تصویر ہوتی یا اسلام کے لیے خلوص اور مسلمانوں کے لیے ذرا سادھی درد ہوتا تو آپ ملت مسلمہ کو مزید منتشر کرنے کی تحریریں کوشش کبھی نہ فرماتے بلکہ مسلمانوں میں اتحاد و ہم آہنگی کا جذبہ پیدا کرنے کی سعی فرماتے۔

مذکورہ عبارت حجۃ الاسلام، مولانا السید غلام حسین صاحب قبلہ مجتہد حیدر آبادی کے تاثرات اور خیالات سے ماخوذ ہے جو ایک طویل گفتگو کی شکل میں عالی جناب شوکت حسین صاحب قبلہ کی مایہ ناز تالیف اعلان حق میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے اور چونکہ میں بہ ذات خود اپنے قلم سے مولانا ندوی صاحب کی پراسرار شخصیت کا تعارف نہیں کرانا چاہتا تھا اس لیے مناسب تھا کہ اسی گفتگو کے اقتباس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کروں۔

- رسول نے بیٹھ کر نماز پڑھی، حضرت علیؓ بھی موجود تھے۔ (المرتضیٰ ص ۹۰-۹۱)
- ۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے بارہ میں یہ نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہوگا۔ (المرتضیٰ ص ۱۲۱)
- ۵۔ واقعہ قلم و قرطاس کے ذیل میں مولانا ندوی کا یہ کہنا ہے کہ کاغذ طلب کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین دن تک حیات رہے لیکن دوبارہ قلم و قرطاس طلب نہیں کیا، اور خلافت کے بارہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی، اس روز متعدد وصیتیں بھی کیں مگر ان میں خلافت کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ ان وصیتوں میں یہ تھا کہ نماز اور روزہ کا خیال رکھا جائے اور غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کیا جائے (المرتضیٰ ص ۱۲۳)

مولانا ابوالحسن ندوی نے غزوہ بدر، احد، خندق اور خیبر کے اجمالی تذکرے میں خلفاء کی شمولیت کا کوئی ذکر نہیں کیا، شاید اس لیے کہ ان معرکوں سے خلفاء کا فرار ثابت ہے، غزوہ حنین کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس لیے کہ آپ کے مدد و حین کا پول کھلتا۔ غزوہ تبوک کی واپسی پر واقعہ عقبہ کو اس لیے نہیں چھیڑا کہ منافقوں کے چہرے بے نقاب ہوتے، میرے نزدیک مولانا کا یہ طرز عمل بددیانتی پر مبنی ہے۔

- ۵۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی ”نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کی شرائط و مطالبات“ کے ذیل میں فرماتے ہیں ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے جو مشکل صورت حال سامنے آگئی تھی اور جس پیچیدہ مسئلہ سے یہ نوخیز امت دوچار تھی، اور جس سے مفر بھی نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن اس حادثہ کو پیش آنا ہی تھا کہ یہی سنت الہی ہے جس کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے،

- ۵۔ ابوطالب نے اسلام قبول نہیں کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا اٹال تھا۔ (المرتضیٰ ص ۳۹)
- ۵۔ ابوطالب کے بڑے بیٹے طالب کی غزوہ بدر کے بعد حالت شرک میں موت واقع ہوئی (المرتضیٰ ص ۴۰)
- ۵۔ عقیل ابن ابوطالب فتح مکہ کے بعد ایمان لائے (المرتضیٰ ص ۴۰-۴۱)
- ۵۔ شیعوں کی بڑی جماعت کو یقین ہے کہ حضرت علیؓ کی ولادت اندرون کعبہ ہوئی، لیکن محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ ان کا خیال ہے کہ کعبہ میں جو صاحب پیدا ہوئے وہ حکیم بن حمزہ ام تھامہ (المرتضیٰ ص ۴۸-۴۹)
- ۵۔ اگر ابو بکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔ (المرتضیٰ ص ۱۱۱)
- ۵۔ تبلیغ سورہ برات کے ذیل میں مولانا ابوالحسن صاحب ندوی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر الحج بنا کر تین سو حاجیوں کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا تاکہ آپ اسلامی طریقے سے انھیں حج کرائیں اور حضرت علیؓ کو سورہ برات کی ابتدائی آیتوں کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ اس کی تبلیغ فرمائیں۔ راہ میں دونوں سے ملاقات ہوئی تو ابو بکر نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ میں مامور کی حیثیت سے چل رہا ہوں۔ (المرتضیٰ ص ۸۶-۸۷)
- ۵۔ غدیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا دوست اور حامی میں ہوں اس کے دوست اور حامی علیؓ ہیں (المرتضیٰ ص ۸۷-۸۸)
- ۵۔ اپنی علالت کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو نماز پڑھانے کا حکم دیا، چنانچہ آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی، اور

ہوں اور صحیح عقیدہ اور دین کی اصلیت پر غبار نہ آنے دیا ہو۔

(۳) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ اسلام کا صحیح ادراک اور اس کی حقیقت اور روح اس کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ، جنگ کی حالت میں، صلح کی صورت میں، خون و دہشت کی فضا میں، امن و سلامتی کی ساعتوں میں، اتحاد و یگانگت کی حالت میں، تنگی و ترشی میں اور فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی میں ہر ہر موقع اور ہر ساعت میں اس کے پیش نظر ہو۔

(۴) اس کی یہ خصوصیت ہو کہ دین کی حقیقت و اصلیت اور اس کو قائم و دائم رکھنے کی فکر اور اس کی غیرت اس کے اندر اس سے بدرجہا زیادہ ہو جس قدر کسی کو اپنے گھرانہ، ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کی عزت و حرمت کے بارہ میں غیرت ہوتی ہے اور اس راہ میں محبوب سے محبوب شے اور عزیز سے عزیز ہستی کی پاسداری، کوئی تاویل و توجیہ، کسی طرح کا خوف یا طمع حائل نہ ہو سکتا ہو۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا اور مرضی کو عمل میں لانے اور ان کی تکمیل کا اس کے اندر بے پایاں جذبہ ہو اور آپ کے راستے سے سرمو انحراف بھی اس کو گوارا نہ ہو اور اس سلسلہ میں کسی ملامت کا ڈر نہ ہو۔

(۶) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ وہ دنیاوی جاہ و ثروت کا طالب نہ ہو اور نہ اس کو اپنے عیش و آرام کی فکر ہو، دولت دنیا اور لذت عیش کے معاملہ سے اس درجہ بے نیاز و یکسو ہو کہ سوائے اس کے قائد و ہادی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملتی ہو، اپنے یا اپنے خاندان

”جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی خدا کی یہی عادت رہی ہے اور تم خدا کی عادت میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے“ (سورہ احزاب - ۶۲)

اس صورت حال پر قابو پانے کا ایک ہی راستہ تھا، اور وہ یہ کہ ایسا غلیفہ منتخب کر لیا جائے جس میں ایسی خصوصیات ہوں جن کے ذریعہ (اللہ تعالیٰ کی توفیق ارزانی کی بدولت) وہ دین کو تحریف سے بچائے جائے اور امت کو جادہ متقیم سے منحرف نہ ہونے دے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو چھوڑا ہے، وہ خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اسلام لانے کے بعد سے زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکمل اعتماد کا اس کو شرف حاصل رہا ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس کی شہادت دی ہو اور دین کے متعدد اہم ارکان اور اہم ترین ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لیے اس کو اپنا قائم مقام بنایا ہو۔ اور ایسے خطرات سے پُر مواقع پر اس کو اپنے ساتھ لیا ہو، جس کے لیے اسی کو انتخاب کیا جاتا ہے جس پر پورا اعتماد اور مکمل بھروسہ ہو۔

(۲) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ بلاخیز آندھیوں کے وقت جبکہ دین کی روح اور اس کی اصلیت کا چراغ جھللا رہا ہو اور اس کے بجھ جانے کا خطرہ ہو، ایسے سخت طوفان کے عالم میں جبکہ بڑے بڑے دل گردہ والے ایمان یقین کے پیکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طویل صحبت و رفافت کا شرف رکھنے والے بھی سہم رہے ہوں، یہ شخص پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہا ہو اس نے اس موقع پر (اثبات و استقامت میں) انبیاء سابقین کے کردار کا مظاہرہ کیا ہو، جس نے نگاہوں سے پردے اٹھادیے

اصلیت کا چراغ جھللا رہا تھا اور اس کے بجھ جانے کا خطرہ لاحق تھا، اور اس وقت جبکہ بڑے بڑے دل گردہ والے، ایمان و یقین کے پیکر اور پیغمبر اسلام کی طویل صحبت و رفاقت کا شرف رکھنے والے سہم رہے تھے، پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے اور آپ نے ثبات و استقامت کی منزل میں انبیاءے ماسبق کا کردار کیا۔

(۴) حضرت ابوبکر کے رگ و پے میں، اسلام کے صحیح ادراک اور اس کی حقیقت کی روح تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ جنگ کی حالت میں، صلح کی صورت میں، خوف و دہشت کی فضا میں، امن و سلامتی کی ساعتوں میں، اتحاد و یگانگت کی حالت میں آپ کے پیش نظر تھا۔

(۵) یہ کہ حضرت ابوبکر میں دین کی حقیقت و اصلیت اور اس کو قائم و دائم رکھنے کی فکری صلاحیت بدرجہا زیادہ تھی۔

(۶) یہ کہ حضرت ابوبکر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا اور مرضی کو عمل میں لانے اور ان کی تکمیل کا بے پایاں جذبہ موجود تھا اور آپ کو جادہ رسالت سے سرمو انحراف گوارا نہ تھا۔

(۷) بعد وفات پیغمبر قائد و ہادی کی حیثیت سے حضرت ابوبکر کے علاوہ دوسری مثال نہیں ملتی۔

پھر تحریر فرماتے ہیں:-

۵۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کس طرح مکمل اعتماد تھا، اس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ نے انتہائی خطرات سے پُر سفر میں ان کو ساتھ لیا۔ یہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا سفر تھا“ (الترغی ۱۰۱)

کے لیے کسی حکومت کے قیام اور اس کی توسیع و ترقی کا خواب بھی کبھی اس نے نہ دیکھا ہو جیسا کہ قریب ترین ممالک (روم و فارس) کے حکمران خاندانوں کا قدیم و تیرہ رہا ہے کہ ان کی ساری مساعی خاندانی سلطنتوں اور بادشاہتوں کی تاسیس و توسیع کے لیے وقف رہی ہیں۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ان شرائط پر ہر طرح سے پورے اترے اور وہ ان تمام خصوصیات کے جامع تھے۔ اپنی خلافت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اور آپ کی وفات کے بعد اپنے عہد خلافت میں آخری دم تک۔ اس طرح ثابت قدم رہے کہ کسی انکار کرنے والے یا شک کرنے والے کے لیے انکار یا شک کی گنجائش نہیں ہے اور آپ کی یہ خصوصیات بدیہی صورت میں اور تو اتر کے ساتھ ثابت ہیں“ (الترغی ص ۹۸ تا ۱۰۱)

حضرت ابوبکر کی شان میں عربی انداز کا یہ نثری قصیدہ، جو اردو کا روپ اختیار کر کے مولانا ندوی کے قلم کی زبان پر جاری ہو کر صفحہ قرطاس پر آیا، مہلات پر منحصر ہے۔ اور اس کی متذکرہ بالا عبارت کا اجمالی مفہوم یہ ہے کہ:-

(۱) حضرت ابوبکر دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنی زندگی کی آخری سانس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع اور فرمانبردار رہے اور آنحضرت کو آپ کی ذات پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا۔

(۲) یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہم ترین ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لیے آپ کو اپنا قائم مقام بنایا اور ایسے خطرناک مواقع پر آپ کو اپنے ساتھ رکھا، جس کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے جس پر مکمل اطمینان اور بھروسہ ہو

(۳) یہ کہ حضرت ابوبکر بعد وفات پیغمبر اس وقت جبکہ دین کی روح اور اس کی

حضرت فاطمہؑ کی عیادت کے لیے گئے، اجازت طلب کی، حضرت علیؑ نے ان سے کہا کہ دروازہ پر ابو بکر کھڑے ہیں، اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں، اگر تم چاہو تو ان کو اجازت دے دو، حضرت فاطمہؑ نے فرمایا کہ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟ کہا ہاں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابو بکرؓ اندر آئے، معذرت کی، گفتگو کی اور وہ (حضرت فاطمہؑ) ان سے خوش ہو گئیں۔

۵۔ مشہور ہے کہ حضرت علیؑ نے ضروری سمجھا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے احسانات و جذبات کا کسی درجہ لحاظ کریں۔ اس لیے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی پھر جب فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں تو حضرت علیؑ نے برسر عام بیعت کی (ص ۱۵۱)

۵۔ حضرت علیؑ زندگی بھر حضرت ابو بکرؓ کے اُن کی خلافت کے زمانہ میں ان کے معاون ان کے بہترین مشیر اور سچے خیر خواہ تھے (ص ۱۵۲ و ۱۵۴)

۵۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے لیے اس لیے نامزد کیا تھا کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ عمر فاروقؓ میں قوت فیصلہ، مستقل مزاجی، اصابت رائے اور عقل و رائے کی پختگی بدرجہ اتم موجود ہے۔

(ص ۱۶۲-۱۶۴)

۵۔ حضرت علیؑ نے اپنی صاحبزادی ام کلثومؑ کو حضرت عمرؓ کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ (ص ۱۶۶)

۵۔ جب حضرت عمرؓ کی وفات ہو چکی تو حضرت علیؑ آئے اور حضرت عمرؓ کے چہرے کو کھولا پھر کہا: اے ابو حفصؓ آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں، اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے علاوہ

”اس کا رنامہ (رفاقت سفر) کو قرآن کریم نے ذکر کر کے دوام عطا کر دیا۔“ (اس وقت) دو ہی شخص تھے جن میں (ایک ابو بکرؓ تھے) دوسرے (خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے“ (سورہ توبہ - ۴۰) (المرتضیٰ ص ۱۰۲)

”یہ وہ مدح ہے جس میں حضرت ابو بکرؓ کا کوئی سہم و شریک نہیں ہے۔“ (المرتضیٰ ص ۱۰۲)

۵۔ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کوئی اتفاقی بات نہ تھی، جس کو کہیں کہ بات بن گئی اور نہ کوئی سازش تھی، جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ کبھی کبھی اس طرح کی سازشیں کامیاب ہو جاتی ہیں، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا جو غالب اور حکمت والا ہے طے کر دہ معاملہ تھا۔ (المرتضیٰ ص ۱۳۰)

۵۔ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ اس وقت منصب خلافت پر فائز ہوئے جس وقت صحابہ رسولؐ بلکہ پوری امت میں ان سے افضل اور ان سے زیادہ جہات خلافت کا بار اٹھانے والا کوئی دوسرا نہیں رہ گیا تھا۔ (ص ۱۳۶)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علیؑ سے قبل جو خلفا ہوئے وہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام سے (معاذ اللہ) افضل تھے۔

۵۔ تمام اور محدثین کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: ”ہم پیغمبروں کا گروہ (کسی مال کا کسی کو) وارث نہیں بنانا جو چھوڑ دیا وہ صدقہ ہوتا ہے“ (ص ۱۳۷)

۵۔ باغ فدک کے معاملے میں حضرت فاطمہؑ کو حضرت ابو بکرؓ سے شکوہ رہا، لیکن جب حضرت فاطمہؑ کی علالت نے شدت اختیار کی تو حضرت ابو بکرؓ

کوئی ایسا نہیں ہے جس کے نامہ اعمال کے ساتھ میں اللہ کے سامنے
جاننا پسند کروں۔ (ص ۱۹۶)

۵۔ حضرت علیؑ، حضرت عمرؓ کی وفات پر رو رہے تھے، ان سے پوچھا گیا
کہ کیوں رو رہے ہیں تو فرمایا کہ عمرؓ کی موت پر رو رہا ہوں۔ عمرؓ کی موت
اسلام میں ایک ایسا شگاف ہے، جو قیامت تک پُر نہیں کیا جاسکے گا
(المرتضیٰ ص ۱۹۶)

۵۔ جب عثمان کی بیعت ہونے لگی تو حضرت علیؑ نے بھی بیعت کی۔ پہلے کی
یا آخر میں اس میں اختلاف ہے۔ (ص ۲۰۲)

۵۔ جب رقیہ کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی
دوسری صاحبزادی ام کلثوم کا عقد بھی حضرت عثمان سے کر دیا اسی
لیے ان کا لقب ذوالنورین تھا۔ (ص ۲۰۳) وغیرہ وغیرہ

عقائد ملتِ جعفریہ کے خلاف یہ تمام باتیں جنھیں مولانا ندوی نے تحریر فرما کر
مباحثات و مناظرات کا دروازہ کیا ہے، ایسی ہیں جسے شیعہ قوم برداشت کرنے سے
قاصر ہے۔

اس لیے

ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا ندوی کو نئے انداز و نئے ڈھنگ سے جواب دیا
جائے اور جواب کے ساتھ مولانا ندوی صاحب کی خدمت میں ان کے مدد میں خلفاء
کی سیرت اور کردار کا (پیدائش سے وفات تک کے حالات پر مبنی) وہ تاریخی آئینہ
پیش کیا جائے جس کی ضرورت ہے تاکہ موصوف کو وہ سب کچھ نظر آجائے جو تاریخ
کی کتابوں میں ہونے کے باوجود ان کی نظروں سے دانتہ یا نادانتہ طور پر
اوجھل ہے۔

اس اہم موضوع پر خامہ فرسائی سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ خلفاء کو
اہمیت و افضلیت عطا کرنے میں مورخین و محدثین کا طریقہ کار کیا تھا اور کن حالات
کے تحت خلفاء کے حق میں فضیلتوں، حدیثوں اور روایتوں کا مہل سرمایہ تاریخ کی
کتابوں میں جمع ہوا جو اسلام اور اہل اسلام کے لیے مصیبت بن گیا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں حدیثوں کے بیان کرنے کا جو طریقہ رائج تھا وہ
زبانی تھا۔ باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ عہد معاویہ میں شروع ہوا جب امیر
شام نے عبید بن شریہ کو جو زبانی حدیثوں کا راوی تھا، صنفاء سے بلا کر کتابوں
اور محروروں کے ذریعہ اس کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو قلم بند کرایا۔ جس کے نتیجہ
میں کئی کتابیں عالم وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام کتاب الملوک
و اخبار الما فضتین ہے جو معاویہ کے حکم سے لکھی گئی کتابوں میں غالباً سب سے پہلی
کتاب ہے۔ عبید کے بعد عوانہ بن الحکم (المتوفی ۴۴ھ) کا نام قابل ذکر ہے جو
اخبار و انساب کا ماہر تھا۔ اس نے عام کتابوں کے علاوہ خاص بنی امیہ اور معاویہ
کے حالات پر ایک کتاب لکھی جو پہلوی زبان میں تھی اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں
۱۱۷ھ میں ہشام بن عبد الملک کے دور میں ہوا۔

۱۴۳ھ میں جب تفسیر، فقہ اور حدیث کی تدوین شروع ہوئی تو دیگر علوم
کے ساتھ تاریخ و رجال میں بھی مستقل کتابیں لکھی گئیں اور محمد بن اسحاق (المتوفی ۱۵۱ھ)
نے سیرت نبوی پر ایک کتاب منظور عباسی کی تحریک پر لکھی جو غالباً فن تاریخ کی پہلی
کتاب ہے۔

اس کے بعد تاریخ بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی اور بڑے بڑے
نامور مورخ پیدا ہوتے رہے، ان مورخین میں جن لوگوں نے خاص طور پر صحابہ
کے حالات قلم بند کیے ان میں نصر بن مزاحم کوئی، مصنف کتاب الجمل، سیف بن

عمر الاسدی مصنف کتاب فتوح الکبیر، معمر بن راشد کو فی مصنف کتاب المغازی
عبد اللہ بن سعد زہری مصنف کتاب فتوحات خالد بن ولید، ابو البختری و ہب
بن و ہب مصنف کتاب صفت النبی و فضائل انصار، ابو الحسن علی بن محمد
عبد اللہ بن اسحاق، احمد بن حارث خزار (مدائنی کا شاگرد) عبد الرحمن بن عبیدہ مصنف
مناقب قریش، معمر بن الشبہ مصنف کتاب امراء الکوفہ و امراء البصرہ وغیرہ
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ ان مصنفین کی کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں لیکن دیگر کتابیں جو اس
زمانے یا اس سے قریب تر زمانے میں لکھی گئیں ان میں بہت کچھ سرمایہ ان کتابوں
کا محفوظ ہے۔ مثلاً عبد اللہ بن مسلم قتیبہ کی کتاب المعارف۔ احمد بن داؤد
ابو حنیفہ دینوری (المتوفی ۲۴۹ھ) کی کتاب اخبار الطوال۔ محمد بن سعد و اسدی
(المتوفی ۲۴۰ھ) کی کتاب طبقات ابن سعد (جو بارہ جلدوں میں ہے) محمد بن ابی
یعقوب بن واضح کی کتاب تاریخ یعقوبی۔ احمد بن یحییٰ بلاذری کی کتاب
فتوح البلدان اور نساب الاشراف۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (المتوفی ۳۱۰ھ)
کی کتاب تاریخ طبری (جو تیرہ جلدوں میں ہے) علی بن الحسین المسعودی (المتوفی
۳۸۴ھ) کی کتاب مروج الذهب اور کتاب الاشراف التنبیہ وغیرہ۔ یہ تصانیف
جس دور کی ہیں وہ متقدمین کا دور کہلاتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز
سے متوسطین کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ابن اثیر، سمعانی، ذہبی
ابو الفدا، نویری اور سیوطی وغیرہ نے نام پیدا کیا۔ مگر ان لوگوں میں خاص کمی
یہ تھی کہ تاریخ میں اضافہ کے بجائے انھوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا وہ یہ تھا کہ
متقدمین میں سے کسی کی تصنیف سامنے رکھ لی اور اس میں تغیرات و
اختصار پیدا کر کے اس کی ہیئت بدل دی لیکن اس طریقہ کار کے باوجود ان

کتابوں کو عوامی حلقہ میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی اور تاریخ ابن اثیر
نے وہ شہرت و مقبولیت حاصل کی کہ اکثر قدما کی تصنیفیں ناپید ہو گئیں۔
غرض کہ ابن اثیر کے بعد جو مورخین ابھرے انھوں نے بھی اپنی کتابوں کا ماخذ
ابن اثیر کی کتاب کو قرار دیا۔ لیکن اس فہرست میں ابن خلدون کا نام شامل
نہیں ہے کیونکہ اس کا انداز سب سے الگ ہے۔

بہر حال مختصر یہ کہ اموی اور عباسی عہد میں احادیث اور فقہ کی اشاعت
بکثرت ہوئی اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں جھوٹی حدیثوں اور غلط روایتوں کی بنیاد پر
خوب خوب کتابیں لکھی گئیں اور چونکہ بنی امیہ اور بنی عباس کے حکمرانوں نے طاقت
اور دولت کا استعمال کر کے خاص توجہ کے ساتھ کتابیں تصنیف کرائیں اس لیے ظاہر
ہے کہ ان کتابوں میں خلفائے ثلاثہ، بنی امیہ اور بنی عباس کے لیے ان کی فضیلت
میں کیا کچھ نہ لکھا ہوگا۔ جب کہ یہ طے شدہ بات ہے کہ معاویہ کی حکومت کی بنیاد حضرت
عثمان کی خلافت پر تھی۔ حضرت عثمان کی خلافت حضرت عمر کی مرہون منت تھی، حضرت
عمر کی خلافت حضرت ابو بکر کی نوازشوں کا نتیجہ تھی اور خود حضرت ابو بکر کی خلافت
سقیفہ بنی ساعدہ میں دھاندلی اور بے ایمانی کا حاصل تھی۔ چنانچہ حق فروش اور
بے ضمیر محدثین اور مورخین نے دنیاوی منفعت کے لیے غلط، لغو، اور مہمل حدیثوں
سے کتابوں کے دامن کو بھر دیا اور ہزاروں کی تعداد میں جعلی اور فرضی حدیثیں قلم
کے ذریعہ استحکام پائیں۔

معاویہ کے دور استبداد میں یہ ناممکن تھا کہ خلفاء کی شان کے خلاف کوئی ایک
حرف بھی اپنی زبان پر لاتا، اگر وہ ایسا کرتا بھی تو اس کی زبان گدی سے پھینچ لی جاتی
اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے۔ اس کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں چلا
دی جاتیں۔ یہی وہ خاص وجہ تھی کہ خلفاء کے لیے تاریخ کا دامن جعلی حدیثوں اور غلط

روایتوں سے جھلک پڑا۔

چنانچہ امام بخاری نے جب اپنے دور میں صحیح حدیثوں کو جمع کرنا چاہا تو کئی لاکھ حدیثوں میں سے اپنی جامع میں کل ۳۹۳ حدیثوں کو جگہ دے سکے اور اگر ان میں سے مکررات کو علاحدہ کر دیا جائے تو مجموعی طور پر ۲۷۱ حدیثیں باقی رہ جاتی ہیں۔ فرضی اور بے بنیاد حدیثوں کے اس طوفان نے اسلام اور اس کے مقصد کو جو انصاف عظیم پہنچایا اس کی تلافی پھر ممکن نہ ہو سکی۔ کیونکہ ان فرضی حدیثوں میں سے بہت سی مقبول ہو کر رواج پا گئیں جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال بے سبب پیغمبر کی طرف منسوب ہو گئے اور امام ابو حنیفہ کے دور میں حدیثوں کا جو دفتر تیار ہوا وہ لغویات، حملات اور غلط سے پر تھا۔

محدثین کا کہنا ہے کہ امام مالک نے جب موٹا لکھی تو اس وقت اس میں احادیث کی تعداد دس ہزار تھی لیکن تحقیق کے بعد یہ تعداد صرف چھ سات سو رہ گئی۔ امام شافعی کا کہنا ہے کہ ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں بہت ہی کم تعداد میں ہیں، کیونکہ حضرت ابو بکر نے جو حدیثیں رسول اللہ سے روایت کی ہیں ان کی کل تعداد سترہ ہے۔ عمر بن خطاب کی روایتوں سے پچاس سے زیادہ حدیثوں کا ثبوت نہیں ملتا اور سہی حال عثمان کا بھی ہے۔

اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بھی بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو حاکم کے نزدیک بالکل درست ہیں لیکن ائمہ احادیث کے نزدیک غلط اور مہمل ہیں۔ اور یہی نوعیت ان حدیثوں کی بھی ہے جنہیں ابو نعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اور تقریباً ہی صورت خطیب بغدادی، ابوالفضل، ابوموسیٰ، ابن عساکر اور حافظ عبد الغنی کی پیش کردہ حدیثوں کی بھی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے بھی فرمایا ہے کہ ابو نعیم، خطیب بغدادی، ابوالفضل،

ابوموسیٰ مدائنی اور حافظ عبد الغنی وغیرہ جو حدیثوں کے امام تھے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ خلفاء اور صحابہ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے۔ (سیرۃ النبوی ص ۳۹)

معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان جوں کہ اہل سنت کے دینی پیشوا اور مذہبی مقتدا تھے اس لیے اس مسلک کے راوی ان کے فضائل میں بے دھڑک غلط اور فرضی روایتیں اور حدیثیں بیان کرتے گئے اور علماء انھیں آنکھ بند کر کے اپنی کتابوں میں جمع کرتے گئے۔

غلط حدیثیں وضع کرنے میں ابو ہریرہ سب پر بھاری تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس حدیثیں ڈھالنے کی آٹومیٹک مشین تھی۔ چنانچہ صرف تقی ابن مخرمہ کی مسند میں ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار تین سو بتائی گئی اور بخاری کا کہنا ہے کہ ابو ہریرہ سے آٹھ سو علماء نے حدیثیں روایت کی ہیں چنانچہ جو حدیثیں نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر مبالغہ آرائی پر منحصر ہیں اور خلفاء کے فضائل میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

جلیل القدر سنی عالم محمد بن عقیل کا کہنا ہے کہ امام حسنؑ سے صلح کے بعد معاویہ نے اپنے ہر گورنر، ہر حاکم اور ہر والی کو یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ جو شخص حضرت علیؑ کے فضائل اور ان کی خوبیاں بیان کرے گا، حکومت اس سے بری الذمہ رہے گی۔ چنانچہ اس فرمان کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں اور دیہاتوں کے واعظ اور خطیب منبروں سے حضرت علیؑ پر تبرک کرنے لگے۔ اس نئی مصیبت اور افتاد میں سب سے زیادہ کوفہ کے لوگ مبتلا ہوئے، کیونکہ وہاں شیعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مستزاد یہ کہ معاویہ نے ان لوگوں پر زیادہ ابن سمیہ کو گورنر کی حیثیت سے مسلط کر دیا۔ یہ آل رسول

یہ فرمان جاری کرنا پڑا کہ حضرت عثمان پر حدیثیں زیادہ ہو چکی ہیں لہذا اس سلسلے کو روک کر راویوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی شان میں حدیثیں بیان کریں اور اس بات کا خاص لحاظ رکھیں کہ جیسی حدیثیں حضرت علیؓ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں بالکل ویسی ہی حدیثیں شیخین کے لیے بیان کی جائیں کیونکہ یہ تدبیر میرے لیے باعث مسرت ہے۔

اس فرمان کے بعد حضرت عثمان کی شان میں حدیث سازی کا سلسلہ بند ہوا اور حضرات ابو بکر و عمر کے لیے راویوں کی زبان پر احادیث و روایات کی نقل اُگنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جعلی اور فرضی حدیثوں اور روایتوں کے کھلیان لگنا شروع ہو گئے۔ اور ایسی ایسی خود ساختہ اور خود روحدیثیں عالم وجود میں آگئیں جن کی حیثیت چاند و خانے کی گپ سے زیادہ قطعی نہیں ہے۔

یقیناً یہ وہ سیلاب تھا جس میں بڑے بڑے علماء، حفاظ اور مذہبی علوم کے علمبردار بہہ گئے۔ مستزاد یہ کہ یہی حدیثیں مدرسوں میں بھی رائج کر دی گئیں اور انھیں کی روشنی میں طلباء کو درس دیا جانے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو سچ تھا وہ جھوٹ بن گیا اور جو جھوٹ تھا اسے سچ مان لیا گیا۔ مختصر یہ کہ معاویہ کی اس کوشش نے خلفائے ثلاثہ کو نہ صرف فضیلتوں کے آسمان پر پہنچا دیا بلکہ کہیں کہیں پر انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی افضل بنا دیا۔

دور حاضر میں یہی طریقہ کار سعودی حکومت کا ہے جس کے حکمرانوں پر پلنے والے حق فروش و ضمیر فروش علماء معاویہ کی ”حدیث مینو فکچرنگ کمپنی لمیٹڈ“ کی بنی ہوئی جعلی اور فرضی حدیثوں کے ذریعہ آل محمدؐ کے تقدس کو پامال کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ان کا یہ نہیں چلتا کہ کب اور کس وقت فضائل آل محمدؐ کو کتابوں سے خارج کر کے وہ جگہ خلفائے ثلاثہ کی فضیلتوں سے بھر دیں جو درحقیقت

کا جانی دشمن، بدترین مخالفت اور کوفہ کے شیعوں سے بخوبی آگاہ اور واقف تھا چنانچہ اس نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ اس نے ہر شیعہ کو گرفتار کیا اور اسے قتل کیا۔ قتل ہونے سے جو بچ گئے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیے گئے یا ان کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں چلا دی گئیں اور ہزاروں افراد کو درختوں پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ لاکھوں بے گھر اور آوارہ وطن کر دیے گئے۔ ایسے اندوہ ناک اور خونچکاں ماحول میں بھلا کس کی مجال تھی جو خلفاء کی شان کے خلاف زبان کھولنے کی جسارت کرتا۔

معاویہ نے اپنے گورنروں اور والیوں کے نام یہ فرمان بھی جاری کیا کہ حضرت علیؓ کے کسی بھی شیعہ کی بیان کی ہوئی کسی بھی روایت یا حدیث کے بارے میں کسی گواہی کو قبول نہ کیا جائے اس کے برعکس جو لوگ حضرت عثمان کے فضائل میں حدیثیں بیان کریں انھیں حکومت کی جانب سے خصوصی مراعات اور عزت دی جائے اور ان کی فہرست مرتب کر کے ہمارے پاس ارسال کی جائے تاکہ انھیں نوازا جاسکے۔ الغرض یہ شاہی فرمان جہاں جہاں پہنچا اسے خصوصی اہتمام کے ساتھ مشہر کیا گیا اور حضرت عثمان کی شان میں حدیثیں جمع کرنے کے لیے جگہ جگہ کاتب مقرر کیے گئے۔

اس فرمان کا اثر یہ ہوا کہ دولت و ثروت کے بھوکے راوی زمین سے پیدا ہونا شروع ہو گئے اور ہر کاذب انسان راوی بن گیا۔ چنانچہ لوگ حضرت عثمان کی شان میں بے سروپہ کی حدیثیں بیان کرتے اور کتابوں سے انھیں لکھوا کر معاویہ کے پاس بھیج دیا جاتا اور وہاں سے انعامات و جاگیروں کے پروانے جاری ہو جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی کم وقفہ میں عثمان پر حدیثوں کا ایسا زبردست انبار اور ڈھیر لگ گیا کہ خود معاویہ بھی پریشان ہو گیا اور اسے

کچھ بھی نہیں ہیں۔

یقیناً یہ ایک ایسا خطرناک منصوبہ ہے جس کی تکمیل کے بعد اصل اسلام کی جگہ صرف عبدالوہاب کا خود ساختہ اسلام رہ جائے گا اور ہماری آنے والی نسلیں آل محمد اور اسلام محمد کے بارے میں وہ سب کچھ بھول جائیں گی جو انہیں یاد رکھنا چاہیے۔ اور یہی وہ احساس ہے جس کے تحت مجھے ”المرقئی“ کے جواب میں قلم اٹھانا پڑا اور نہ یہ حقیقت ہے کہ میں ایک شاعر ہوں اور صرف شاعر، دینی تالیفات کا میدان میرا نہیں ہے۔

چنانچہ اسی حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے اپنی اس کتاب میں وہی کچھ پیش کیا ہے جو اس سے قبل کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تالیف میں میرا اپنا ذاتی قلمی سرمایہ کچھ نہیں ہے میری محنت صرف اتنی ہی ہے کہ میں نے مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تاریخی جواہر پاروں کو سمیٹ کر مولانا ابوالحسن ندوی کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین کی گرانقدر رائے پر منحصر ہے۔

میں نے اپنی اس تالیف میں عربی اور فارسی کی اصل عبارتوں کے بجائے صرف ترجمہ اس لیے پیش کیا ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جو عربی اور فارسی نہیں جانتے اس کتاب سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

آخر کلام میں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ میں اپنی اس کتاب میں کسی فرقہ کے کسی مسلمان سے مخاطب نہیں ہوں۔ بلکہ میرے مخاطب صرف مولانا ابوالحسن صاحب ندوی اور وہابی مسلک سے تعلق رکھنے والے حضرات ہیں اور میری یہ کتاب صرف ”المرقئی“ میں پیش کیے گئے اخلاقی مسائل

کے جواب میں ہے اور بس۔۔۔

والسلام

فروغ کاظمی

۲۴ جنوری ۱۹۹۰ء

قطعہ

کچھ ایسے مناقب بھی اسلام میں تھے، جنہیں اپنا بزم رسالت میں اکثر نبی نے بلایا، بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا۔

مگر ان کی بھڑائی فضیلت میں ندوی نے بھڑائی حدیثوں کا لے کر سہارا جو چاہا وہ ”المرقئی“ میں بھی لکھا، نہ سوچا نہ سمجھا، نہ دیکھا نہ بھالا۔

فروغ کاظمی

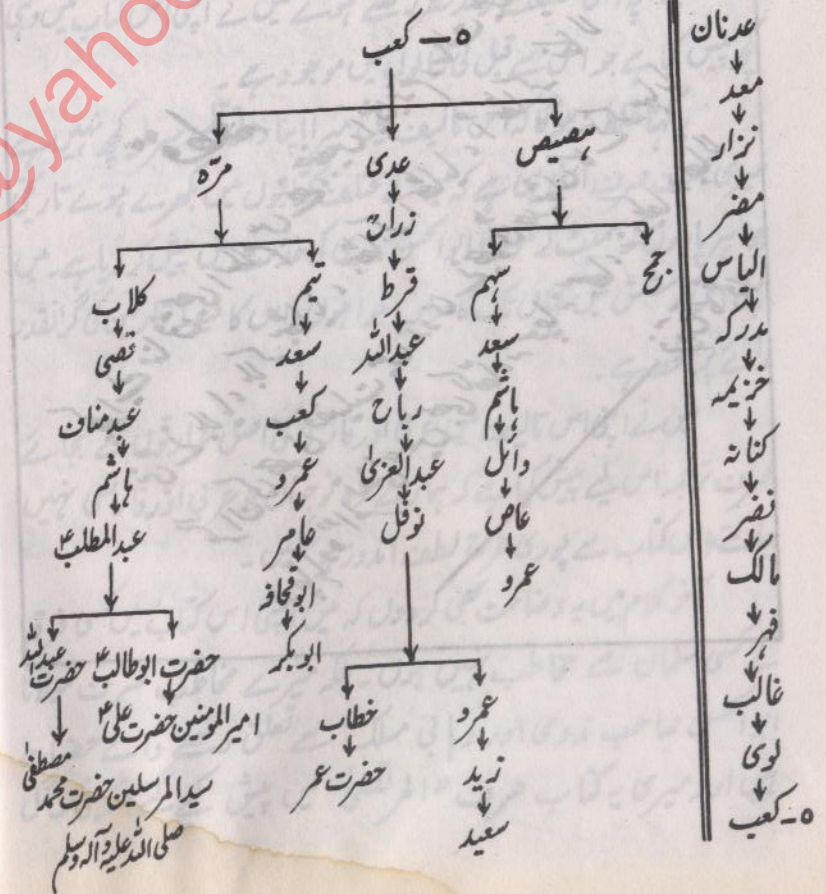
قریش کون؟

حضرات شیخین یعنی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو خاندان یا قبیلہ قریش میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔ لہذا پہلے یہ تحقیق ضروری ہے کہ درحقیقت ان کا تعلق خاندان قریش سے تھا بھی یا نہیں۔

علم انساب کے ماہرین اور علم تاریخ کے محققین کے درمیان قریش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں ایک گروہ کا خیال ہے صرف قصی ابن کلاب کی نسل اور اولاد ہی قریش کہلائے جانے کی مستحق ہے جبکہ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جناب قصی کے بزرگ فہر کی پوری نسل قریش ہے۔

اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ہم جناب قصی کی نسل کو قریش تسلیم کرتے ہیں تو ان کے بھائیوں اور بزرگوں کو قریش سے خارج کرنا ہوگا۔ اور اگر قریش فہر کی نسل قرار پائے گی تو اس سلسلے کے جملہ افراد قریش تسلیم کیے جائیں گے یا اسے یوں واضح کر دوں کہ زید نے اپنی ذاتی کمائی سے کوئی جائداد اپنے نام خریدی۔ تو اس جائداد کے مالک اور وارث زید یا ان کی اولادیں ہوں گی۔ بصورت دیگر اگر کوئی جائداد زید کے آباؤ اجداد کی ہے اور اس کی نوعیت موروثی ہے تو اس سلسلے کے تمام افراد اس جائداد کے حقدار، وارث یا مالک ہوں گے ورنہ نہیں۔ اسی طرح اگر جناب قصی، قریش قرار پاتے ہیں تو صرف قصی کی اولادیں قریش قرار

باب اول ابو بکر بن ابوقحافہ شجرہ



میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اور قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا اس لیے وہ قریش کہلائے بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے اس لیے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی گئی۔ (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۱۹)

طبری نے خاندان بنی امیہ کے مشہور حکمران عبد الملک بن مروان کے لیے لکھا ہے کہ اس نے محمد بن جبیر سے پوچھا کہ قریش کا یہ نام کب سے پڑا۔ اس نے کہا کہ جب سے لوگ الگ الگ رہنے کے بعد حرم میں اکٹھا ہو گئے۔ کیونکہ قریش کے معنی جمع ہیں۔ اس جواب پر خلیفہ عبد الملک بن مروان نے کہا کہ میں نے تو آج تک یہ نہیں سنا بلکہ یہ سنتا آرہا ہوں کہ قصی ہی کو قریش کہتے ہیں اور ان سے پہلے کسی کا نام قریش ہوا ہی نہیں۔ (طبری ج ۲ ص ۱۸۸-۱۸۹)

عبد الملک کے انکار کی یہ روایت فتح الباری فی شرح بخاری ج ۲ ص ۳۰۲ اور درمنثور ج ۶ ص ۳۹۸ میں بھی بیان ہوئی ہے اس کے علاوہ مفسرین نے بھی لکھا ہے جس سے یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ قریش کے بارے میں عبد الملک بن مروان کا قول قصی ابن کلاب کے لیے درست ہے۔

ایسی صورت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں ہی دائرہ قریش سے خارج ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعتبار شجرہ یہ دونوں حضرات قصی ابن کلاب کی اولادوں یا نسل میں نہیں آتے۔ لہذا اس اخراج کی بنا پر حضرات شخین قریش کی فضیلت اور شرف سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ کیونکہ تمام عرب میں قریش ہی کو سب سے زیادہ عزت اور توقیر حاصل تھی اور وہی عربوں کے سردار تسلیم کیے جاتے تھے۔ باقی تمام قبیلے قریش کے ماتحت اور فرماں بردار تھے۔

پائیں گی۔ قصی کے باپ دادا یا خاندان کے دیگر افراد قریش نہیں ہو سکتے۔ محققین کے گروہ اول میں علامہ عبد ربہ کا کہنا ہے کہ قصی ابن کلاب نے چونکہ اہل عرب کو ایک مرکز پر جمع کیا اس لیے وہ قریش کہلائے۔ قریش کے معنی ایک مرکز پر جمع کرنا ہے اور قصی کو جمع کرنے والا کہتے ہیں (عقد الفرید ج ۲ ص ۱۱۹) ابن اثیر جزری کا قول ہے کہ جب عرب کو قصی نے جمع کیا تو انھیں لوگ قریش کہنے لگے کیونکہ قریش کے معنی اچھی طرح جمع ہونا ہے اور دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ جب قصی ابن کلاب حرم کے سردار ہوئے اور انھوں نے بہتر دنیا کا کارکردگی انجام دی تو لوگ ان کو قریشی کہنے لگے اور پہلی مرتبہ قصی کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ لفظ اجتماع سے نکلا ہے یعنی قصی میں اچھی صفتیں جمع تھیں، اس لیے انھیں قریش کہا گیا۔ (تاریخ کامل ج ۲ ص ۳۸)

طبری کا کہنا ہے کہ جب قصی حرم (مکہ معظمہ) میں آکر مقیم ہوئے اور اس پر غالب آئے تو وہاں بہت اچھے کام کیے اس لیے لوگ انھیں قریشی کہنے لگے لہذا وہی پہلے شخص ہیں جنھیں یہ نام دیا گیا۔ (تاریخ طبری طبع مصر ج ۲ ص ۱۸۸) علامہ شبلی نے اس واقعہ کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ: ”قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا

بیان ہے کہ قریش کا لقب اول ان ہی کو ملا۔ چنانچہ علامہ عبد ربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چوں کہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں کیونکہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں اسی بنا پر ان کو جمع بھی کہتے ہیں۔ قصی ابن کلاب کا تذکرہ تفصیل سے طبقات ابن سعد جز اول مطبوعہ لندن ۱۳۲۲ھ میں ص ۳۶ تا ۴۲ موجود ہے۔ قریش کی درجہ بندی

۵۔ دین اس وقت تک غالب رہے گا جب تک اس میں امامت قائم رہے گی اور اماموں کی تعداد بارہ ہوگی، جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔ اس کے بعد فتنہ و فساد پھیلے گا اور قیامت آئے گی۔

دکنز العمال ج ۶ ص ۱۹۸ تا ۲۰۲ و ج ۷ ص ۱۳۸ تا ۱۴۰، کتاب الفتن ص ۳۶
صحیح مسلم مطبوعہ دہلی ج ۲ ص ۱۱۹، جامع ترمذی ص ۲۶۹، مشکوٰۃ
شریف ج ۲ ص ۹۳، سنن ابی داؤد ص ۵۸۸، صحیح بخاری ج ۱، باب مناقب، تفسیر درمنثور، تفسیر معالم التنزیل اور جامع الاصول

قریش کی ابتدا چوں کہ قصی ابن کلاب کی ذات خاص سے وابستہ ہے اس لیے جناب قصی سے قبل ان کے خاندان میں جتنے بھی لوگ شامل ہیں انھیں قریش نہیں قرار دیا جاسکتا البتہ جناب قصی یا ان کی نسل میں عبد مناف، عبد المطلب، حضرت عبداللہ، حضرت ابوطالب، حضرت رسول خدا، حضرت علیؑ یا ان کی اولادیں جو درحقیقت قریش میں ان سے انکار بھی ناممکن ہے۔ لہذا حشر میں جو حال شیخین کی غاصبانہ خلافت کا ہوگا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اس کے برعکس کچھ مورخین کا خیال یہ بھی ہے کہ قریش صرف قصی ابن کلاب کی اولادوں میں منحصر نہیں ہیں بلکہ قصی کے بزرگ فہر ابن مالک کی پوری نسل قریش ہے۔ عقل سلیم اور دلائل کی روشنی میں ان مورخین کا یہ خیال قابل قبول اس لیے نہیں ہو سکتا کہ قصی ابن کلاب کا قریش ہونا ثابت ہے پھر بھی ہم اگر اس بے دلیل بات کو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیں تو حضرات شیخین یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر خاندان رسالت سے کوسوں دور ہیں۔ اور حضرت ابوبکر کا شجرہ آٹھویں پشت میں اور حضرت عمر کا شجرہ نویں پشت میں کعب ابن لوی سے ملتا ہے جو رسول خدا کے بھی بزرگ تھے۔ اس کے برعکس حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام

قریش کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگوں کی خوبی اور بھلائی صرف قریش ہیں۔ بغیر قریش کے لوگ زندہ نہیں رہ سکتے، قریش کو وہ فضیلتیں ملی ہیں جو کسی کو بھی میسر نہیں ہوتیں۔ قریش اللہ کے خاص اور پسندیدہ بندے ہیں۔ اگر کوئی قبیلہ قریش کی مخالفت کرے گا تو وہ شیطان کا گروہ ہوگا اور جو شخص قریش کی ذلت و خواری چاہے گا اللہ اس کو ذلیل و خوار کرے گا۔

(خلاصہ کنز العمال ج ۶ ص ۱۹۸ تا ۲۰۰)

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا تعلق قریش سے نہیں ہے، ان کی خلافتوں کا محل خود بخود ڈھیر ہو جاتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے سوا داعی عظم کا یہ دعویٰ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ خلیفہ قریش سے ہی ہوگا اور خلافت صرف قریش میں ہی محدود رہے گی، ظاہر کرتا ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرات شیخین کا یہ کہنا کہ وہ قریش ہیں غلط بیانی پر منحصر تھا اور ان کا یہ اقدام خلافت ان تمام ارشادات پیغمبر کی نفی میں تھا جو زبان پیغمبر پر جاری ہوئے۔ مثلاً،

۵۔ میری خلافت اور حکومت کے حقدار صرف قریش ہیں، جب تک کہ وہ اللہ کی نافرمانی نہ کریں۔

اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت رسول کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ اول قریشی ہونا دوسرے معصوم ہونا۔ یعنی کسی بھی حالت میں اللہ کی نافرمانی نہ کرنا۔

۵۔ اس امت (اسلام) کی حکومت اور امارت صرف قریش ہی میں رہے گی اور جو شخص قریش سے دشمنی رکھے گا اللہ اس کو منہ کے بھل جہنم میں جھونک دے گا۔

۵۔ میرے بعد دین و دنیا کے حاکم بارہ ہوں گے اور وہ سب قریش ہی ہوں گے

ابوبکر خلیفہ تھے یا خالفہ؟

نہایہ ابن اثیر میں ہے کہ ایک روز ایک عرب نے حضرت ابوبکر سے دریافت کیا کہ کیا آپ خلیفہ ہیں؟ جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں خلیفہ نہیں خالفہ ہوں۔
۵۔ صاحب نہایہ خالفہ کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ خالفہ وہ ہوتا ہے جس میں کوئی خیر و خوبی نہ ہو۔

۵۔ قاموس میں خالفہ کے معنی سفیہ کے ہیں۔

(اصحاب ثلاثہ، ص ۵۵ بحوالہ نہایہ ابن اثیر)

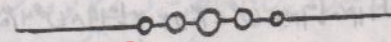
۵۔ لغات کشوری میں سفیہ کے معنی میں نادان، کم عقل اور بے وقوف، تحریر ہے۔

لہذا کسی وہابی کا یہ کہنا کہ حضرت ابوبکر فہم و فراست کے حامل تھے، محض خوش فہمی، خوش اعتقادی اور ابوبکر نوازی کی دلیل ہے۔

پیدائش

تاریخ کی کسی کتاب میں میری نظر سے آج تک ایسی کوئی روایت نہیں گزری جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت ابوبکر کی تاریخ پیدائش کیا ہے۔ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ آپ، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوا دو برس یا تین برس چھوٹے تھے اور آپ ۶۲ء میں متولد ہوئے۔ لیکن بخاری (باب الحجۃ)

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔ اس حیثیت سے خلافت پر حضرت علیؑ کا حق زیادہ تھا نہ کہ حضرات شیخین کا۔



کی ایک روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کو روانہ ہوئے تو آگے اونٹ پر حضرت ابوبکر سوار تھے کیونکہ یہ بوڑھے تھے اور انھیں لوگ پہچانتے تھے۔

بہر حال حضرت ابوبکر چھوٹے تھے یا بڑے، اس سے آپ کی فضیلت میں کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں تو سوال تاریخ پیدائش کا ہے کہ ملت مسلمہ خلیفہ اول کی تاریخ پیدائش سے بیگانہ کیوں ہے؟ اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر کی شخصیت ایسی تھی ہی نہیں کہ اس دور کے راوی یا اسلام کے ابتدائی دور کے محققین و مورخین آپ کی تاریخ ولادت کی طرف متوجہ ہوتے اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو میں مولانا ابوالحسن صاحب ندوی سے گزارش کروں گا کہ وہ ثبوت کے ساتھ اپنے اس دینی پیشوا اور مذہبی مقتدا کی تاریخ پیدائش کی وضاحت فرمادیں۔

ابوبکر کی وجہ تسمیہ اور نام

مصر کے مشہور مصنف محمد حسین بیگل کی عربی کتاب ”حضرت ابوبکر“ کے مترجم محمد احمد پانی پتی ابوبکر کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ: ”بکر عربی میں جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ چونکہ ابوبکر کو اونٹوں کی پرورش و پرہیزگاری کا بے حد شوق تھا اور آپ اونٹوں کے علاج و معالجہ میں بھی مہارت رکھتے تھے اس لیے آپ کو لوگوں نے ابوبکر (اونٹ کا باپ) کہنا شروع کر دیا اور آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔“

(حضرت ابوبکر ص ۲۵)

حضرت ابوبکر کا نام ان کے زمانہ کفر میں عبدالکعبہ تھا۔ اسلام قبول کرنے

کے بعد عبداللہ ہوا لیکن آپ کی کنیت نے آپ کے کسی نام کو ابھرنے نہ دیا اور آج ساری دنیا آپ کو ابوبکر کے ہی نام سے جانتی ہے۔

حلیہ

عبدالرحمن بن حافض عمر الدین نے اپنی کتاب ”ابوبکر کی سوانح عمری“ میں حضرت ابوبکر کا حلیہ یوں تحریر فرمایا ہے:

”حضرت ابوبکر کا رنگ سفید زردی مائل تھا۔ بدن چھبر اور پیشانی باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ رخسار اس قدر چمکتے تھے کہ چہرے کی سب رنگیں ابھری رہتی تھیں۔ ڈاڑھی ہر وقت ہندی اور خضاب سے رنگین رہتی تھی اور سب سے خاص بات یہ تھی کہ ہاتھ کی انگلیوں پر بال بالکل نہیں تھے۔“

(سوانح عمری حضرت ابوبکر مولفہ عبدالرحمن ص ۱۳۴)

براہ اعتبار علم قیافہ آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہونا بغض اور کینہ پروری کی علامت ہے اور ہاتھ کی انگلیوں پر بال نہ ہونا بزدلی اور نامردی کی دلیل ہے۔

ابتدائی زندگی

حضرت ابوبکر کے بچپن یا جوانی کے بہت کم واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں اور جو واقعات ہیں بھی ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کی زندگی کے ابتدائی خدوخال کیا تھے؟ جس وقت آپ مسلمان ہوئے اس وقت آپ کے باپ ابو قحافہ زندہ تھے لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کے باپ پر آپ کے اسلام لانے کا کیا اثر ہوا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں اپنے باپ ابو قحافہ سے

(۳) فحشاء السلی یا ایاس السلی کو زندہ آگ میں جلایا۔ (حکم خلاف شرع تھا)

(۴) چور کا بایاں ہاتھ کٹوایا۔ (یہ حکم بھی خلاف شرع تھا)

(۵) آپ مسئلہ کلالہ و میراث جہدہ سے ناواقف تھے۔ (کنز العمال)

(۶) آپ کے پاس ایک یہودی آیا اور اس نے آپ سے تین سوالات

کیے۔ (۱) کون سی چیز اللہ کے لیے نہیں ہے (۲) کون سی چیز اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ (۳) کون سی چیز اللہ نہیں جانتا۔

یہودی کے یہ سوالات سن کر آپ بغلیں جھانکنے لگے۔ آخر کار وہ یہودی جواب نہ پا کر آپ کی علمی صلاحیتوں کو کوتاہا ہوا باب شہر علم کی چوکھٹ پر آیا۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے مسکراہٹ سے اس یہودی کا استقبال کیا اور فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تو کس ارادے سے آیا ہے پھر آپ نے اس کے سوالوں کے جوابات مرحمت فرمائے اور فرمایا کہ اللہ لا شریک ہے یعنی کسی شے کی شرکت کا تصور اللہ کے لیے نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے نزدیک فقر و غور نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ اپنے نفس کے لیے بیٹا، بیٹی نہیں جانتا۔ جوابات سن کر وہ یہودی مسلمان ہوا اور کہا کہ بے شک آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی و جانشین ہیں۔

اسی قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو حضرت ابوبکر کے استعداد علمی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ لیکن سخت حیرت اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایسے خلیفہ کا تقابل اس مقدس اور عظیم ترین شخصیت سے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد ہے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کے دروازہ ہیں۔

(کوکب درمی ص ۱۵۷، نایب المودۃ باب ۱۰، ۱۱، اربع المطالب ص ۱۳۱، صحیح ترمذی، مستدرک حاکم،

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711
MAIL : devjani@netcourier.com

کیا اثر قبول کیا۔

والدین

حضرت ابوبکر کے والد کا نام عثمان بن عامر اور ان کی کنیت ابو قحافہ تھی۔ والدہ کا نام سلمیٰ تھا جو صخر بن عمرو کی صاحبزادی اور ابو قحافہ کی چچا زاد بہن تھیں۔ حضرت ابوبکر کے والد قحافہ نے ۹۷ برس کی عمر پائی۔ فتح مکہ کے بعد ۳ھ میں مسلمان ہوئے اور ۱۲ھ ہجری میں موت سے ہمکنار ہو گئے۔ اس طرح آپ کل چار سال کچھ ماہ مسلمان رہے اور اپنی زندگی کے ۹۴ برس آپ نے کفر اور بت پرستی میں گزارے۔

تعلیم

حضرت ابوبکر چونکہ زمانہ جاہلیت کی پیداوار تھے اور کفر و بت پرستی کی چھاؤں میں آپ نے آنکھیں کھولی تھیں اس لیے جہل آپ کے ظاہر و باطن میں فطرتاً داخل تھا۔ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ملت مسلمہ کے خلیفہ ہونے کے باوجود تمام مسائل شرعیہ سے ناواقف و نابلد تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے (۱) ایک دادی نے اپنے مرحوم پوتے کی جائیداد سے اپنا حق طلب فرمایا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تیرا حق نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث میں کسی مسلمان فقیہ سے دریافت کر لوں تو جواب دوں۔

(مشکوٰۃ شریف، مؤطا ص ۳۸۷)

(۲) دادی کی موجودگی میں آپ نے متوفی کی جائیداد کا چھٹاں حصہ نانی کو

دلوایا۔ (تحفۃ العباد ص ۴۵۵)

اور صواعق محرقة وغیرہ)

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی علمی حیثیت کی تشریح ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ امام شہلبنی تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کے علم و فہم وغیرہ کے لیے بہت سی جلدیں درکار ہیں۔ محمد ابن طلحہ شافعی کا کہنا ہے کہ امام المفسرین جناب ابن عباس سے مروی ہے کہ علم و حکمت کے دس درجوں میں سے نو حضرت علی کو ملے ہیں اور دسویں میں تمام دنیا کے علماء شامل ہیں اور اس دسویں درجہ میں بھی علی کو اولیت اور افضلیت حاصل ہے۔

مولائے کائنات کی بے پناہ علمی صلاحیتوں اور عظیم المرتبت شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے بیروت کے عیسائی ادیب فوائد الاحترام البتانی اپنی کتاب ”حضرت علی ابن ابی طالب، نبج البلاغہ و درس منتخبات“ میں تحریر فرماتے ہیں:

”حضرت علی کی شخصیت ایک خاص کشش والی شخصیت ہے جس

کے گرد روایت، حدیث اور مورخین کے قلم گردش کرتے رہتے ہیں اور

ناقدین و مفکرین کی عقلیں اس شخصیت کو سمجھنے میں کوشاں رہی ہیں اور

زہاد و ارباب سلوک کے اذہان ان کی سیرت اور طرز زندگی کی طرف

متوجہ رہے ہیں اور ان کے علم کے سائے میں ارباب ادب کی ایک

بڑی جماعت چلتی رہتی ہے۔ مختلف اور جداگانہ نظریات اور کثیر التعداد

مناظرات جو یہ امتداد زمانہ سنی اور شیعہ فرقوں میں رہا کیے ہیں وہ اس

عظیم الشان انسان کی بلندی اور رفعت میں اضافہ ہی کرتے رہے ہیں

اور اس کے کمالات عقلیہ کی نمائش ان مناظرات کے پردوں سے جو

کبھی گہرے اور اکثر اوقات ہلکے رہے ہیں زیادہ ہی ہوتی رہا ہے۔“

(ماخوذ از بلاغ المبین ج ۲ ص ۱۵۰۰ تا ۱۵۰۱)

قول پیغمبر ہے کہ میری امت میں سب سے زیادہ عالم و دانا میرے بعد علی ابن ابی طالب ہیں۔ (کوکب دری ص ۱۸۱)

حضرت علی علیہ السلام نے خود بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے علم کے ہزار باب تعلیم فرمائے ہیں اور میں نے ہر باب سے ہزار باب پیدا کر لیے ہیں۔ ایک منزل پر یہ بھی فرمایا ہے کہ رسول اللہ نے مجھے اس طرح علم بھرایا ہے جس طرح کبوتر اپنے بچہ کو دانہ بھراتا ہے۔ ایک مقام پر یہ بھی فرمایا کہ میری زندگی میں جو چاہو مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ تمہارے درمیان میں نہ رہوں اور ایک مقام پر یہ فرمایا کہ آسمان کے بارے میں مجھ سے جو سوال بھی کرنا چاہو کرو کیونکہ مجھے زمین کے راستوں سے زیادہ آسمان کے راستوں کا علم ہے۔ ایک موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم مجھے علم ہے کہ قرآن کی کون سی آیت کہاں نازل ہوئی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خشکی میں کون سی آیت نازل ہوئی اور تری میں کون سی آیت نازل ہوئی۔

اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے اس تالیف کے دامن میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس علمی سلسلے کو آگے بڑھایا جاسکے بس یہی کہنا کافی ہے کہ جو علم رسول کا حامل ہو اس سے جاہلوں کا کیا تقابل! چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

پیشہ

سن و شعور کو پہنچ کر حضرت ابو بکر نے اپنے باپ کا پیشہ اختیار کیا اور کپڑے کی تجارت شروع کی جس میں آپ نے اپنی نفع خوری کی بدولت بڑا مال کمایا اور غیر معمولی ترقی کی یہاں تک کہ آپ کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں ہونے لگا۔

کے مبعوث بہ رسالت ہوتے ہی اسلام لائے۔ بعض نے خوش اعتقادی کی حدود سے گزر کر آپ کو سابق الاسلام بھی کہہ دیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ کا نمبر چوتھا ہے اور بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ حضرت ابوبکر نے اسلام اس وقت قبول فرمایا جب پچاس سے زیادہ افراد مسلمان ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس ذیل میں حضرت ابوبکر کے شیدائی مولوی عبدالشکور پاننانا لوی کا کہنا ہے کہ پیغمبر کے مبعوث بہ رسالت ہوتے ہی ابوبکر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پھر موصوف نے اپنی کتاب خلفائے راشدین کے حاشیہ پر یہ وضاحت بھی فرمادی کہ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ، لڑکوں میں حضرت علیؓ، غلاموں میں زید بن حارثہ اور آزادوں میں حضرت ابوبکر سب سے پہلے اسلام لائے (خلفائے راشدین ص ۲۰) مولوی عبدالشکور کا نظریہ اول اُن کی اپنی ذہنی کثافت کا آئینہ ہے اور حاشیہ پر کی گئی وضاحت مولانا شبلی نعمانی کے خیال کی تائید میں ہے جسے نعمانی صاحب نے بول تحریر فرمایا ہے کہ سب سے پہلے خدیجہؓ زوہرہؓ، دوسرے حضرت علیؓ تیسرے زید بن حارثہ، مروجاً حضرت کے آزاد کردہ غلام تھے، اور چوتھے شخص ابوبکر تھے جو اسلام لائے (سیرۃ النبی)

اس طرح مولانا شبلی نعمانی نے اسلام اختیار کرنے والوں کی فہرست میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بعد حضرت علیؓ کو پہلے نمبر پر اور حضرت ابوبکر کو تیسرے نمبر پر تسلیم کیا ہے۔ جب کہ عبدالشکور کی وہابیت نے عورتوں، لڑکوں، غلاموں اور آزادوں میں اصل واقعہ کو محصور کر کے حقیقت پر ابہام کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ طبری کی تحقیق مولوی عبدالشکور اور مولانا شبلی دونوں کے نظریہ تحقیق کو باطل قرار دیتی ہے۔ اس ذیل میں طبری کا کہنا ہے کہ:

”محمد بن سعید سے مروی ہے کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا

نفع خوری

نفع خوری کے معاملات میں حضرت ابوبکر کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں تھا۔ گراں فروشی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے رسول اللہؐ کو بھی معاف نہیں کیا اور دوسو درہم کا خریدا ہوا ایک مرل اونٹ رسول اللہؐ کے ہاتھ نو سو درہم کا فروخت کر کے سات سو درہم کا منافع حاصل کر لیا۔ (نور ایمان ص ۵۵ بحوالہ مدارج النبوة) اس واقعہ سے حضرت ابوبکر کی تاجرانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ ایسی صورت میں ”المرفعی“ کے فاضل مولف مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت ابوبکر نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا تھا کیوں کہ قرین قیاس اور قابل قبول ہو سکتا ہے۔

شراب نوشی

حرام ہونے کے باوجود شراب حضرت ابوبکر کے مشرب میں حلال تھی۔ چنانچہ اصحاب ثلاثہ ج ۱ ص ۶ میں بحوالہ فتح الباری تحریر ہے کہ اسلام اختیار کرنے کے بعد بھی آپ شراب نوشی فرماتے رہے اور آپ نے اپنے اس محبوب مشغلے کو ترک نہیں کیا

چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ابوبکر کا مسلمان ہونا

حضرت ابوبکر کے اسلام اختیار کرنے کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر اختلافی ہے بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ حضرت ابوبکر پہلے شخص میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بن کعب بن عبد العزیٰ بن امرؤ القیس بن عامر بن نعمان کلبی جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام تھے اسلام لائے۔ (خلاصہ عبارت سیرۃ النبی ابو محمد بن عبد الملک بن ہشام ج ۱ ص ۲۶۴ تا ۲۶۶)

استیعاب اور اسد الغابہ میں ہے کہ حضرت علیؑ سب سے پہلے اسلام لائے۔ ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ دس برس کے سن میں اسلام لائے، عن المجاہد میں بھی دس برس کی عمر میں اسلام لانا تحریر ہے۔ محمد بن عبد الرحمن زرارہ کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ نو سال کی عمر میں ایمان لائے جبکہ صحیح ترمذی میں آپ کی عمر آٹھ سال بتائی گئی ہے۔ غرض کہ اسی قسم کی تمام روایتیں تاریخ ابوالفداء ص ۱۱۵ تا ۱۱۶ جیب السیراج ج ۱ جزو ۳ ص ۱۵، تاریخ کامل، فردوس الاخبار، سیرۃ العلویہ حصہ اول ص ۱۳۱ اور کعب درری وغیرہ میں موجود ہیں جن سے حضرت علیؑ کے ایمان و اسلام کی تابندگی ظاہر ہوتی ہے۔

ان تمام روایتوں کو نظر انداز کر کے اگر مولائے کائنات کی حیات طاہرہ کا جائزہ لیا جائے تو آپ کی عمر کا کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں ملتا جو (معاذ اللہ) کفر کے سائے میں گزرا ہو یا کسی مورخ کے قلم میں یہ جبارت پیدا ہوئی ہو کہ وہ آپ پر کفر کا بہتان رکھتا۔ لہذا ایسی صورت میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام اور ایمان پر کسی تبصرے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام چونکہ سابق الاسلام اور سابق الایمان تھے اس لیے آپ کے سامنے اسلام قبول فرمانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ تھا تو وہ سابقہ اسلام کے ظاہر کرنے کا تھا اور جسے آپ نے اپنی ولادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خانہ کعبہ میں ظاہر فرما دیا تھا جیسا کہ خلافت الہیہ حصہ اول ص ۳۶ میں ہے کہ:

”جب حضرت علی خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے تو یہ مردہ سن کر

کہ کیا آپ لوگوں میں حضرت ابوبکرؓ سب سے پہلے مسلمان ہوئے تھے انھوں نے کہا یہ بات غلط ہے۔ ابوبکرؓ سے پہلے پچاس سے زیادہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۱۵)

ان اختلافات کے مابین صحیح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ابوبکرؓ کے قبول اسلام کا حقیقی نمبر کیا تھا۔ البتہ حضرت ابوبکرؓ کے مسلمان ہونے کی اصل وجہ کیا تھی؟ اس کے ذیل میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے مسلمان ہونے کا سہرا کاہنوں اور بنجومیوں کے سر ہے۔ کیونکہ آپ نے بنجومیوں سے سن رکھا تھا کہ اسلام عنقریب ترقی کر کے ساری دنیا میں پھیلے گا اس لیے آپ نے اسلام اختیار کر لیا۔ خلاصہ عبارت ازالۃ الخفاء مطبوعہ بریلی ص ۵۷-۵۸ معلوم ہوا کہ اسلام کے محاسن اور اس کی افادیت کے تحت ابوبکرؓ نے اسلام نہیں قبول کیا بلکہ اپنے ذاتی مفاد، حصول مقصد اور مستقبل کی بقا کو مد نظر رکھتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

اس کے برعکس حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام و ایمان کے بارے میں مورخین و محدثین کا جو نظریہ ہے اس کی بھی ایک جھلک پیش کر دینا ضروری ہے تاکہ گفتگو مکمل ہو جائے۔

ابن سعد فرماتے ہیں کہ وادی کا کہنا ہے کہ ہم سب کا اجماع اور اتفاق اس امر پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث یہ رسالت ہوتے ہی حضرت علیؑ پہلے شخص ہیں جو ایمان لائے۔

(خلاصہ عبارت تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱ تا ۲۱۲)

ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت علیؑ ایمان لائے اور آنحضرت کے ساتھ آپ نے نماز پڑھی اس کے بعد زید بن حارثہ بن شریفل

رسول خدا تشریف لائے اور اس نومولود بچے کو اپنی گود میں لیا، انوش
رسالت کی گرمی محسوس ہوئی تو آپ نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے
چہرہ رسول کی زیارت کی اور فرمایا اَسْلَمَ مَوْلَاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ
اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ بعض کتابوں میں دگر
صحیفہ ہائے آسمانی کی تلاوت کرنا بھی مرقوم ہے۔

السلام علیک یا رسول اللہ کہنا خود اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ
عالم وجود میں آتے ہی امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب نے، محمد بن عبد اللہ
کو اللہ کا رسول تسلیم کیا اور قرآن کی تلاوت کر کے اپنے ایمان کو ظاہر کر دیا۔ اور چونکہ
اسلام کی اساس اور بنیاد ایمان پر ہے اس لیے آپ کا اسلام خود بخود ظہور میں
آگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث بہ رسالت ہونے کے بعد حضرت
علی کے لیے اسلام اختیار کرنے یا قبول کرنے کا کوئی مسئلہ قطعی نہیں تھا اور چونکہ
رسول اللہ اور حضرت علی کی خلقت ایک ہی نور سے ہوئی تھی، جیسا کہ پیغمبر نے خود
فرمایا کہ میرا نور اور علی کا نور ایک ہے یا یہ کہ میں علی سے ہوں اور علی مجھ سے ہے۔
(کوکب درمی ص ۱۵۳-۱۵۴) اس لیے اسلام کو دنیا والوں پر ظاہر کرنے کی جو صورت
پیغمبر کے لیے تھی بالکل وہی صورت علی کے لیے بھی تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلعم
نے اللہ کے حکم سے اسلام کا اعلان کر کے الوہیت کے بارے میں کفار کے سامنے
اپنے نظریہ وحدانیت کو پیش کیا تو علی نے بھی اس کی تائید فرما کر اپنے سابقہ اسلام
کو ظاہر کر دیا۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسی عمل کو مورخین نے
اسلام اختیار یا قبول فرمانے سے تعبیر کر دیا۔

تاریخ کامل ۲۶ ص ۲۰ میں ہے کہ حضرت علی نے ظہور اسلام سے سات برس
قبل رسول کے ساتھ نماز پڑھی۔

تاریخ الامم والملوک میں عبادہ ابن عبد اللہ سے مروی ہے کہ حضرت علی نے
فرمایا کہ میں بندہ خدا ہوں اور رسول کا بھائی ہوں اور میں ہی صدیق اکبر اور فاضل
اعظم ہوں۔ میں نے ظہور اسلام سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔
(تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱)

رسول اللہ نے فرمایا:

”علی میرے بعد ہر مومن کا حاکم اور ولی ہے۔ میں خلائق کو ڈرانے
والا ہوں اور علی ہدایت کرنے والے ہیں۔ علی کا دوست مومن ہے اور
دشمن منافق۔ علی تقسیم بہشت اور دوزخ ہیں۔ علی کی دوستی انسان کے
گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جیسے آگ ایندھن کو۔ علی کی دوستی
ایسی نیکی ہے کہ اس نیکی کے ہوتے ہوئے کوئی بدی ضرر نہیں پہنچاتی اور
علی کی دشمنی ایسا گناہ ہے کہ اس گناہ کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ
نہیں پہنچاتی۔ علی کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ جو علی کو ایذا پہنچا
خداوند عالم اس کو قیامت میں یہودی اور نصرانی اٹھائے گا۔ علی کی
محبت کے بغیر کوئی صراط مستقیم سے گذر نہیں سکتا۔“

(کوکب درمی ص ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۸)

مسعودی نے بھی حضرت علی کو سابق الاسلام تسلیم کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں،
”جناب علی ابن ابی طالب اور ان کے اسلام کے بارے میں لوگوں
نے جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک کثیر تعداد علماء اور محققین
کی رائے یہ ہے کہ حضرت علی نے کبھی شرک اور کفر نہیں کیا اس وجہ سے
یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب اسلام لائے۔ کیونکہ وہ ہر ایک فعل میں حضرت
رسول خدا صلعم کی متابعت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں

جو جھگڑا پیدا کیا گیا اور اس کے جواز میں جو روایتیں مورخین کے قلم سے بیان ہوئیں وہ محض ابو بکر وغیرہ کو علی کا ہمسرا بنانے کی کوشش میں تھیں اور عقلی دلائل کی روشنی میں ان کی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابو بکر اور دیگر دو خلفاء چونکہ کافر، مشرک، خاظمی اور غیر معصوم تھے اس لیے مسلمان کہلائے جانے کے لیے ان کا اسلام اختیار کرنا ضروری تھا۔ لیکن وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اسلام اختیار کرنے والوں کی فہرست میں حضرت ابو بکر کا نمبر چوتھا ہے یا پچاس کے بعد۔۔۔

صدق اکبر کون؟

تفسیر درمنثور مطبوعہ مصر ج ۶ ص ۱۵۴ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صدیقین میں صرف تین افراد شامل ہیں جن میں اول علی ابن ابی طالب ہیں جنہوں نے میری رسالت کی گواہی دی۔ دوسرے حبیب بن جریج جو مومن آل نبین ہیں اور انہوں نے حضرت عیسیٰ کی گواہی دی۔ تیسرے حزقیل مومن آل فرعون ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ کی گواہی دی۔

ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول خدا صلعم فرمایا کرتے تھے کہ تمام امتوں میں سبقت کرنے والے صرف تین ہیں جو ایک لمحہ کے لیے بھی کافر نہیں ہوئے۔ اول علی ابن ابی طالب، دوسرے صاحب بسین، تیسرے مومن آل فرعون ہیں۔ اور سبھی صدیقین میں ہیں اور علی ان سے افضل ہیں۔ (کوکب درمی ص ۱۵۴)

حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صدیق تین ہیں۔ اول علی ابن ابی طالب، دوسرے حبیب بن جریج جنہوں نے کہا تھا کہ اے میری قوم والو! رسولوں کی تابع داری کرو، تیسرے حزقیل جنہوں نے یہ کہا تھا کہ تم اس آدمی کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب

سن بلوغ کو پہنچے۔ اسی لیے خدا نے انہیں عصمت عطا کی اور انہیں تمام برائیوں سے پاک و صاف رکھا کیونکہ یہ نفس رسول تھے۔ اور یہ دونوں یعنی حضرت رسول خدا اور حضرت علی اطاعت و عبادت پر مجبور نہیں کیے گئے بلکہ دونوں نے اپنے اختیار سے بلا جبر اللہ کی اطاعت و عبادت کو اختیار کیا۔ علماء کی ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ سب سے پہلے علی اسلام و ایمان لائے۔ (مروج الذهب مطبوعہ ۱۲۸۳ھ ج ۱ ص ۳۰۷)

مسعودی کے اس بیان سے حسب ذیل صراحت ہوتی ہے:

(۱) یہ کہ حضرت علیؑ اور ان کے اسلام کے بارے میں لوگوں نے جھگڑا کیا اور ان کی کوشش کی تاکہ آپ کے سابق الاسلام یا سابق الایمان ہونے کو مشکوک بنایا جاسکے۔

(۲) حضرت علیؑ علیہ السلام نے از ابتدا تا انتہا کبھی شرک اور کفر اختیار نہیں کیا (۳) حضرت علیؑ کا ہر فعل اور ہر عمل، پیغمبر اسلام کے ہر فعل اور ہر عمل سے مکمل طور پر متابعت اور مطابقت رکھتا تھا۔

(۴) یہ کہ جس طرح رسول کا اسلام ازلی تھا اسی طرح حضرت علیؑ کا بھی اسلام ازلی تھا اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے کب اسلام اختیار کیا۔ (۵) اللہ نے حضرت علیؑ کو عصمت عطا کی اور تمام کثافتوں اور برائیوں سے پاک رکھا۔

(۶) علیؑ نفس رسول تھے۔

(۷) اللہ نے علیؑ اور محمد کو اپنی اطاعت و عبادت پر مجبور نہیں کیا بلکہ ان لوگوں نے اپنی مرضی اور اختیار سے عبادت الہی کو قبول کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام اختیار کرنے کا

مخاطب ہو کر ”تم لوگوں“ کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر تنہا مشرک نہیں تھے بلکہ آپ کے ساتھ کچھ لوگ اور شامل تھے۔ ممکن ہے کہ یہ اشارہ حضرت عمر کی طرف رہا ہو۔ (واللہ اعلم)

بہر کیف حضرت ابوبکر اور ان کے ہمراہیوں کو وہ شخص مشرک قرار دے رہا ہے جس نے قرآن کریم کا یہ حکم سنایا تھا کہ مشرک پر جنت حرام ہے۔
قول رسول پاک ہے اللہ کی قسم دنیا کے مشرکین پر جنت حرام ہے (مولف)

ابوبکر کا شیطانی ایمان

امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ: ”ایمان ابوبکر و ایمان ابلیس واحد است“ یعنی ابوبکر کا ایمان اور شیطان کا ایمان ایک ہے (نور ایمان ص ۵۵ بحوالہ تاریخ بغداد مولف ابن جریر)
امام ابو حنیفہ کے اس قول کی تائید خود حضرت ابوبکر کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ جب اجماع سقیفہ کے دوسرے دن آپ نے مسجد نبوی کے منبر سے مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ اے مسلمانو! اگر میں سیدھی راہ اختیار کروں تو تم مجھے خلیفہ مان کر میری اطاعت کرنا اور اگر میں ٹیڑھے راستے پر چلوں تو تم مجھے ہٹا دینا، کیوں کہ میرے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے جو مجھے ہر وقت بہکایا کرتا ہے اور مجھ پر سوار رہتا ہے۔ (اصحاب ثلاثہ ج ۱ ص ۴۰ بحوالہ تاریخ طبری، ریاض النضرہ، صواعق محرقة اور نور ایمان ص ۴۵ وغیرہ)

اکثر مفکرین کا یہ خیال ہے کہ حضرت ابوبکر کا یہ اشارہ حضرت عمر کی طرف تھا کیونکہ وہی آپ پر سوار رہتے تھے اور ہر وقت بہکایا کرتے تھے۔ لیکن میرے نزدیک اس موقع پر شیطان حقیقی کی طرف ابوبکر کا یہ اشارہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ بہر حال حقیقت کچھ سہی، افسوس تو اس بات پر ہے کہ ندوی صاحب جیسے لوگ

اللہ ہے۔ حضرت علیؓ حزیل اور حبیب بخاری سے افضل ہیں (نیایح المودہ ص ۱۹۲-۱۹۱)
ریاض النضرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کا نام صدیق رکھا تھا۔

عبادہ ابن عبد اللہ کی روایت کے مطابق، حضرت علیؓ علیہ السلام کا خود بھی قول ہے کہ میں بندہ خدا ہوں، رسول اللہ کا بھائی ہوں اور میں ہی صدیق اکبر و فاروق اعظم ہوں۔ میں نے ظہور اسلام سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔ میرے سوا اگر کوئی دوسرا شخص اپنے کو صدیق یا فاروق کہتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔

(تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱ اور تاریخ کامل)

تاریخ کی اکثر کتابوں سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر کو صدیق اور حضرت عمر کو فاروق کا لقب ”معاویہ حدیث مینو فکیرنگ کمپنی لمیٹڈ“ نے دیا ہے جو اصولاً غلط ہے۔

ابوبکر پیغمبر اسلام کی نظر میں

حضرت ابوبکر سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں میں مشرک چوٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ پیغمبر کا یہ ارشاد سن کر ابوبکر نے کہا کہ حضور! مشرک تو وہ ہے جو غیر اللہ کی پرستش (پوجا) کرے۔ ابوبکر کی اس گفتگو پر پیغمبر نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ اے ابوبکر! صفائی نہ پیش کرو۔ بخدا تم لوگوں میں مشرک چوٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ (در منثور ج ۴ ص ۸۴، کنز العمال ج ۱ ص ۲۷۱، اذالۃ الخلفاء ج ۱ ص ۱۹۹، اور تفسیر کبیر بر حاشیہ فتح البیان طبع مصر ج ۵ ص ۲۳۹)

مذکورہ بالا روایت سے دو باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اول یہ کہ ابوبکر، پیغمبر اسلام کی نظر میں مشرک تھے دوسرے یہ کہ پیغمبر نے حضرت ابوبکر سے

وزنی تھا۔

حضرت علی کے ایمان کا لم پر بے شمار حدیثیں، روایتیں اور قرآنی آیتیں دلالت کرتی ہیں جنہیں پیش کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب کے اوراق درکار ہیں۔ آخر میں ایک وضاحت اور کردوں کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کی بدقسمتی سے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ”قسیم النار والجنة“ بھی ہیں۔

گم کردہ راہ ہو گئے منزل شناس لوگ
بدلے گئے اصول سفر جب بھی راہ میں (مولف)

ابوبکر کی نافرمانی اور خدا کی لعنت

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی اپنی کتاب المرتضیٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند اور ناپسند کو اچھی طرح سمجھنا اور انتہائی باریک بینی کے ساتھ ان کا جائزہ لینا اور اس بات کی کوشش کرنا کہ آپ کی وفات کے بعد، آپ کی خواہشوں کے عین مطابق تمام امور انجام پائیں۔ اس کا نمونہ حضرت ابوبکر کے اس اصرار میں ملتا ہے کہ جب انھوں نے حضرت اسامہ کی قیادت میں فوج بھیجی۔ (المرتضیٰ ص ۱۱۰، ۱۱۱) پھر فرماتے ہیں:

”حضرت ابوہریرہ نے اس واقعہ کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابو الاعرج حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔ اس بات کو انھوں نے دوبارہ سہ بارہ دہرایا پھر حبش اسامہ کے بھیجے جانے کا واقعہ بیان کیا، اور اس سلسلہ میں فرمایا

حضرت ابوبکر کے اس شیطانی ایمان کا مقابلہ ”کل ایمان“ کے ایمان سے جب کہ تہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ:

وہ آئینہ ہے اہل کدورت کی زندگی
جس میں کوئی بھی عکس ابھر کر نہ آسکا (مولف)

میرے ذخیرہ ادب میں وہ الفاظ نہیں ہیں کہ جن کے ذریعہ میں ”کل ایمان“ کے ایمان کا حال بیان کر سکوں تاہم یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تاریخی اسناد کے تحت کچھ گفتگو ہو جائے تاکہ بات نامتو نہ رہے۔ اس ذیل میں مولوی عبید اللہ امرتسری کا کہنا ہے کہ علی ہدایت کا جھنڈا اور ایمان کا مینار ہیں۔ علی تمام مومنوں سے ایمان کی منزل میں افضل اور مقدم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خندق کے موقع پر حضرت علی کو کل ایمان کی سند عطا کی۔ علی سید المومنین، امام المتقین، امیر المومنین، صالح المومنین اور مولیٰ المومنین ہیں۔ اور علی کے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہے۔ (اربع المطالب ص ۲۱ تا ۵۱)

علامہ شیخ سلیمان قندوزی فرماتے ہیں کہ جب حُب علی ایمان ہے تو علی کے ایمان کا کیا عالم رہا ہوگا (نیایع المودة ص ۸۰)

سید محمد صالح سنی اسحقی کا کہنا ہے کہ حضرت عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر آسمان اور زمین پر بسنے والوں کا ایمان ترازو کے ایک پلہ میں اور حضرت علی کا ایمان دوسرے پلہ میں رکھا جائے تو علی کے ایمان کا وزن زمین اور آسمان پر بسنے والوں کے ایمان کے وزن سے بڑھ جائے گا۔ (کوکب درمی ص ۱۸۷)

اس ارشاد پیغمبر کی روشنی میں یہ کہنا قطعی غلط نہ ہوگا کہ حضرت علی ابن ابی طالب کا ایمان تمام انبیاء و رسل کے ایمان سے زیادہ

حضرت ابوبکر نے جیش اسامہ کو روانہ کر دیا اور کہا کہ جس جیش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روانہ کر دیا تھا اسے واپس نہیں ہونے دوں گا وہ جہنڈا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باندھا ہے اس کو میں نہیں کھولوں گا (المرتضیٰ ص ۱۱۱، ۱۱۲)

مولانا ندوی نے اپنے بیان یا ابو ہریرہ کی روایت مہملہ کے ثبوت میں کسی مستند کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا جس سے مولانا موصوف کی بددیانتی کا پتہ چلتا ہے۔ اور آپ نے جیش اسامہ کے واقعہ کو جس انداز سے پیش کرنے کی ناکام کوشش فرمائی ہے وہ بجائے خود حقائق کو مسخ کرنے کی بیق دلیل ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ دینا حجت بھی کہ ”اگر حضرت ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی“ رسول اسلام کی سالہ تبلیغی محنتوں پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے۔ لیکن چونکہ مولانا ندوی کا باطل عقیدہ وہابیہ مسلک سے وابستہ ہے اس لیے ان کے نزدیک بے شک ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی یہ عبادت نہ ہوتی جس کا طریقہ وہابیہ مسلک میں رائج ہے بلکہ اللہ کی عبادت اس طور و طریقہ کی پابند ہوتی کہ جو طریقہ پیغمبر نے بتایا تھا یا جسے آل پیغمبر نے اپنایا تھا۔

اپنی تالیف المرتضیٰ میں ابو ہریرہ سے مسلسل اور بے تکلف روایتیں نقل کر کے مولانا نے خود ہی اپنے مولفانہ وقار کو مجروح کر لیا ہے جبکہ یہ حقیقت آپ کو معلوم ہوگی کہ سترہ میں مقام صہبا کی واپسی پر غزوہ دادی القرئی واقع ہوا تھا اور یہودیوں سے جنگ ہوئی تھی، ابو ہریرہ جو یہودی تھے اسی سال مسلمان ہوئے تھے، چنانچہ انھوں نے کل تین سال عہد رسالت میں زندگی بسر کی۔ شرح مسلم نووی ص ۷۷، ۷۸ صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۰۹، الفاروق ج ۲ ص ۱۰۵ اور میزان الکبریٰ ج ۱ ص ۱۷ وغیرہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ حضرت عائشہ، عبد اللہ بن عمر اور حضرت علی وغیرہ ان کے بیان پر

یقین نہیں کرتے تھے اور انھیں جھوٹا تصور کرتے تھے۔

جیش اسامہ کا اصل واقعہ کیا ہے؟ اسے مورخین نے یوں بیان کیا ہے کہ آخری حج کے بعد، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی علالت کے دوران یہ خبر موصول ہوئی کہ حکومت روم مدینہ پر حملہ کر کے اسے تاراج اور برباد کرنا چاہتی ہے، چنانچہ اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں مدینہ پر حملہ نہ ہو جائے آپ نے اسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اور تمام مسلمانوں کو اس امر کی سخت تاکید فرمادی کہ علی کے علاوہ، کوئی بھی مسلمان خواہ وہ انصار ہو یا ہاجر مدینہ میں نہ رہے اور جو میرے اس حکم کو نہ مانے گا اس پر اللہ کی لعنت ہوگی۔ (ابن ابی الحدید شرح بیج البلاغ جز اول ص ۵۳) اس کے بعد آنحضرت نے اسامہ کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے روانہ کیا۔ انھوں نے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر جحرف نامی مقام پر کیمپ لگا کر اکابرین صحابہ کا انتظار کیا لیکن وہ لوگ نہیں آئے۔ (طبری ج ۳ ص ۱۸۵، تاریخ ابوالفداء ج ۱ ص ۱۵۲ مطبوعہ مہر تہذیب و تہذیب علامہ محمد عثمانی مطبوعہ دارالمعارف حیدرآباد دکن جز اول ص ۲۰۸ وغیرہ)

مدارج النبوة ج ۲ ص ۲۸۸، تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۲۰ اور طبری ج ۳ ص ۸۸ میں ہے کہ نہ جانے والوں میں حضرت ابوبکر کے علاوہ حضرت عمر بھی تھے۔

مدارج النبوة، تاریخ کامل اور تاریخ طبری کا شمار، معتبر اور مستند کتابوں میں ہے اور ان کتابوں کے مورخین اہل سنت ہیں۔ لہذا اس بات سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ حضرات شیخین یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دی ہوئی اللہ کی دائمی لعنت کو قبول کر لیا لیکن جیش اسامہ کے ہمراہ نہیں گئے۔ چنانچہ حکم پیغمبر کی اس نافرمانی پر خلاق کائنات نے فرمایا:

”جس شخص نے اللہ اور رسول کے حکم کی نافرمانی کی اور اپنی حدود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سورہ برات نازل ہوئی، آپ نے حضرت علی کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ سورہ برات کی ابتدائی آیتیں لے کر جاؤ اور قربانی کے دن (۱۰ رذی الحجہ کو) لوگوں کو سنا دینا اور بتا دینا کہ جنت میں کوئی کافر نہیں جائے گا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، خانہ کعبہ کا طواف کوئی ننگے جسم نہیں کرے گا اور آنحضرتؐ نے اگر کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا ہے تو وہ زندگی بھر پابند رہیں گے۔

حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ادنیٰ عصباء پر نکلے، راستہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہو گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؓ نے کہا مامور کی حیثیت سے، دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی رہنمائی میں لوگوں نے مناسک حج ادا کیے۔ جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؓ نے لوگوں میں ان باتوں کا اعلان کر دیا، جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہدایت دی تھی۔ (المقتضیٰ ص ۸۶-۸۷)

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اپنے مذکورہ بیان کے تحت ابن ہشام ق ۲ ص ۴۳ تا ۴۶ کا حوالہ دیا ہے جو پوری عبارت کے اس آخری جملے کی تائید میں ہے کہ جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؓ نے لوگوں (کفار) میں ان باتوں کا اعلان کیا جس کی ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی تھی۔

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت ابوبکرؓ کو امیر راج بنانا، راستے میں حضرت علیؓ سے ابوبکرؓ کا یہ دریافت فرمانا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؓ کا جواب دینا، حضرت ابوبکرؓ کی رہنمائی میں لوگوں کا مناسک حج ادا کرنا وغیرہ، یہ ساری باتیں بے دلیل، بے حقیقت اور خود ساختہ ہیں۔

سے گذر گیا، خدا اس کو جہنم میں داخل کرے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، اور اس میں رسوائی کا عذاب ہے۔“ (النساء - ۱۳)

مدارج النبوة ج ۲ ص ۱۹۴ میں یہ بھی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ آخر صفر میں جب شدید درد سر میں مبتلا تھے تو رات کے وقت دعا کی خاطر آپؐ گھر سے نکل گئے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ سمجھا کہ میری باری میں کسی اور بیوی کے پاس چلے گئے ہیں، چنانچہ آپؐ تلاش میں نکلیں تو حضور کو بقیع میں محدود پایا۔ آنحضرتؐ نے جب عائشہؓ کو دیکھا تو فرمایا کہ اے عائشہؓ کاش تم پہلے مرحلت میں توں تمہارا کفن دفن اچھی طرح کر دیتا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپؐ تو چاہتے ہیں کہ میں مرجاؤں تاکہ آپؐ دوسری شادی کر لیں۔

ابوبکرؓ کی معزولی

اس ذیل میں تاریخی پس منظر سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کی وہ خود ساختہ روایت پیش کر دوں جو آپؐ کی کتاب المقتضیٰ کے ص ۸۶-۸۷ پر موجود ہے تاکہ ناظرین کو صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ مولانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت اور انکسار طبعیت کے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں، ”سنت میں حج فرض ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس سال امیر الحج بنا کر بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو اسلامی طریقہ پر حج کرائیں۔ اس وقت تک مشرکین اپنے طریقوں پر حج کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جن کا حج کا ارادہ تھا، ان کی تعداد تین سو تھی اور وہ سب اہل مدینہ تھے۔“

حج نہ کرے اور نہ ہی کوئی خانہ کعبہ کا برہنہ طواف کرے، اور جنت میں صرف مومن ہی جائے گا اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی شخص کا کوئی معاہدہ ہے تو وہ وقت مقررہ تک ہی رہے گا آئندہ کوئی توسیع نہ ہوگی اور خدا اور اس کا رسول مشرکین سے بری الذمہ ہیں۔ ابھی میں نے صرف تین دن کی مسافت طے کی تھی کہ رسول اللہ نے حضرت علی ابن ابی طالب کو ایک تیز رفتار ناقہ کے ذریعہ میری طرف روانہ کیا اور انھیں تاکید فرمادی کہ وہ مجھ سے سورہ برات لے کر اس کی تبلیغ خود کریں چنانچہ علیؑ نے وہی کیا جو حکم پیغمبر تھا اور میں مایوسی کی حالت میں مدینہ واپس آگیا۔ جب پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا تو ناکامی اور نامرادی کا احساس نے مجھ پر گریہ طاری کر دیا اور میں ہلک ہلک کر رونے لگا، جب دل کچھ ٹھہرا تو میں نے پوچھا کہ کیا میرے متعلق کوئی خاص بات رونما ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہوا وہ اچھا ہوا، مجھے اللہ نے حکم دیا تھا کہ سورہ برات کی تبلیغ میں خود کروں یا وہ شخص اس کام کو انجام دے جو میری آل میں شامل ہو۔ (خلاصہ عبارت من امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۲ بجا النفس رسول ﷺ) اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی نظروں میں حضرت ابوبکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی نمائندگی یا نیابت کے اہل قطعی نہیں تھے۔

سچ بولنے کے بعد عجب حادثہ ہوا کاٹی گئی زبان مری بات بات پر (مؤلف)

غار ثور میں ابوبکر کا گریہ اور پیغمبر اسلام کی ہجرت

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت اور غار ثور کے بارے میں مولانا ابوالحسن صاحب ندوی فرماتے ہیں کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کس طرح مکمل اعتماد تھا، اس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ نے

جو محض حضرت علیؑ پر ابوبکر کو افضل ظاہر کرنے کی غرض سے بیان کی گئی ہیں اور ان باتوں کے ضمن میں کسی مستند کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

اس حقیقت کو مستند و معتبر کتابوں کی روشنی میں، میں تحریر کرتا ہوں۔ اگر ممکن ہو سکے تو مولانا ندوی صاحب انکار فرمائیں تاکہ آپ کی علمی صلاحیتیں کچھ اور اجاگر ہو کہ اہل علم کے سامنے آجائیں۔ واقعہ یہ ہے:-

سورہ برات کی ابتدائی دس آیتوں نے کفار و مشرکین پر خانہ کعبہ میں داخلہ کی سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ چنانچہ سرحدی الحجۃ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اس کام پر مامور فرمایا کہ وہ مکہ معظمہ جا کر دوران حج ان آیات قرآنی کی تبلیغ فرمائیں۔ ابوبکرؓ اپنی اس عارضی فضیلت پر ناز فرماتے ہوئے تین سو حاجیوں کے قافلے کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ بد قسمتی سے آپ ابھی راستے ہی میں تھے کہ واپس بلا لیے گئے اور یہ سعادت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کر دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ جب کبیدہ خاطر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اپنی معزولی پر اشکبار ہوئے اور آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ کیا میرے بارے میں کوئی خاص بات واقع ہوئی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کوئی خاص بات نہیں، اس امر میں خدا کا حکم ہے کہ میں خود جاؤں یا میری آل میں سے کوئی جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ شیخین میں دونوں تھے مگر معزول کیے گئے۔ ملاحظہ ہو قرۃ العین ۲۳۲، صبح بخاری پٹ ص ۲۳۸، ریاض النفرہ ص ۴۷، تاریخ طبری ج ۳ ص ۳۱۰، کنز العمال ج ۱ ص ۱۲۶ اور خصائص نسائی ص ۶۱ وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے سورہ برات دے کر روانہ کیا تھا کہ میں اہل مکہ میں جا کر یہ اعلان کر دوں کہ اس سال کے بعد کوئی بھی کافر و مشرک

پس علی بن ابی طالب ایسا شجاع و بہادر موجود تھا، جو آپ کے دشمنوں پر تنہا بھاری آپ کا بہترین رفیق سفر، مددگار اور ساتھی تھا، چاہتے تو آپ امیر المؤمنین کو اپنے ساتھ لے لیتے لیکن علیؑ کو اپنے بستر پر سلا کر، آپ کا اپنے گھر سے تنہا نکلنا اور سفر ہجرت اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو کسی مددگار، ساتھی یا رفیق سفر کی ضرورت نہیں تھی بلکہ آپ کو اپنے معبود پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا اور وہی آپ کی حفاظت کر رہا تھا جو تمام کائنات پر غالب اور حاوی ہے۔

حضرت ابو بکر کو، جو غزوات اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کے کسی محاذ پر نہ ٹھہرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتماد کا مرکز اور ان کے تحفظ کی ضمانت قرار دینا مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کا وہ کارنامہ ہے جس کو نہ عقل تسلیم کر سکتی ہے اور نہ صداقت کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔

ہجرت یا غارتور سے متعلق جو واقعات مورخین نے تحریر کیے ہیں۔ ان سے ہٹ کر ندوی صاحب نے اپنا قیاسی خاکہ الگ مرتب کیا ہے جبکہ اس سلسلے کے واقعات یوں ہیں کہ:-

کفار مکہ نے دار النذہ میں جمع ہو کر ابو سفیان کی تجویز کے مطابق قتل رسولؐ کا منصوبہ تیار کیا تھا اس پر عذر امد کی غرض سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو آپ نے امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام سے فرمایا کہ کفار مکہ نے آج کی شب مجھے قتل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور میرے لیے اللہ کا یہ حکم ہے کہ میں تمہیں اپنے بستر پر سلا کر ہجرت اختیار کروں۔ علیؑ نے دریافت کیا کہ کیا میرے سونے سے آپ کی جان بچ جائے گی پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اللہ کا یہی حکم ہے۔ علیؑ نے کہا کہ مجھے آپ کی سلامتی مطلوب ہے، میری جان جائے یا رہے آپ حکم الہی کے مطابق عمل کریں۔ میں آپ کی

انتہائی خطرات سے پُر سفر میں ان کو ساتھ لیا، یہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا سفر تھا جب کہ دشمن گھات میں تھے۔ ایسے سفر میں کوئی صاحب عقل انسان ایسے شخص کو اپنا راز دار و دمساز نہیں بنا سکتا جس پر اس کو مکمل بھروسہ نہ ہو جب کہ معلوم ہو کہ قدم قدم پر خطرہ تھا، تلاش کرنے اور تعاقب کرنے والوں کا جال بچھا ہوا تھا، اس وقت سفر میں اسی کو ساتھ لیا جاتا ہے جو اپنی جان اور زندگی سے زیادہ اپنے محبوب و آقا رفیق کو عزیز رکھتا ہو۔ (المقتضی ص ۱۱)

پھر فرماتے ہیں،
”اس کارنامہ (رفاقت سفر) کو قرآن کریم نے ذکر کر کے دوام عطا کر دیا۔

”اس وقت) دو ہی شخص تھے، جن میں (ایک ابو بکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے۔ اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دے رہے تھے کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے“ (سورہ توبہ - ۱۰)

یہ وہ مدح ہے جس میں ابو بکر کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے (المقتضی ص ۱۱) یہ ضروری نہیں ہے کہ محض اعتماد ہی کی بنیاد پر کوئی کسی کو اپنا شریک سفر بنائے۔ اکثر مجبوری اور مصلحت کے تحت انسان کو وہ کرنا پڑتا ہے جو وہ نہیں چاہتا پھر ایسے حالات میں جب کہ قدم قدم پر جان کا خطرہ لاحق ہو، اس شخص کو ساتھ لیا جاتا ہے جو ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے مضبوط، طاقتور، باہمت، جو انمرد، شجاع اور بہادر ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

یقیناً پیغمبر اسلام چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے اور آپ کے

میکائیل کی نگرانی میں محو خواب تھے اور اللہ کا حبیب اپنے معبود کی حفاظت میں اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

حدود مکہ سے باہر نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کیا جیسے کوئی ناقہ سوار آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ پیغمبر تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے، تیز رفتاری کے سبب آپ کا پائے اقدس، پہاڑی علاقہ کی نامہوار زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر سے اس طرح ٹکرایا کہ ساری انگلیاں لہو لہان ہو گئیں۔ لیکن ناقہ سوار کا برابر تعاقب براہِ جاری رہا، آخر کار پیغمبر نے آتے ہوئے ناقہ سوار کو بغور دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شاید ابوبکر ہیں۔ آپ ٹھہر گئے۔ پیغمبر اندازہ غلط نہیں تھا، تعاقب کرنے والے حضرت ابوبکر ہی تھے (صحیح بخاری ج ۱ حصہ ۱ ص ۶۹) پیغمبر اسلام نے اس اندیشے کے تحت کہ کہیں دشمنوں کو خبر نہ ہو جائے ابوبکر کو اپنے ساتھ لے لیا کیونکہ آپ ابوبکر کی منافقت اور ریشہ دوانیوں سے بخوبی واقف تھے اور اس وقت ابوبکر کو چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ غرض کہ مختصر سا سفر طے کر کے آنحضرت ابوبکر کو لیے ہوئے غارِ ثور تک پہنچے اور حکم الہی اس میں داخل ہو گئے۔ صحیح بخاری کے اسی صفحہ میں یہ بھی ہے کہ جس ناقہ پر ابوبکر سوار تھے اس کو پیغمبر اسلام نے بہ قیمت خرید لیا۔ مدارج النبوة میں ہے کہ دو سو درہم کی خریدی ہوئی اونٹنی ابوبکر نے وقت اور موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر پیغمبر کے ہاتھ نو سو درہم کی بیچی اور پیغمبر اسی پر سوار ہو کر غارِ ثور تک پہنچے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار میں داخل ہو گئے تو حکم خدا مکڑی نے غار کے دہانے پر جال اتن دیا، کبوتروں نے انڈے دے دیے اور ببول کا ایک درخت بھی پیدا ہو گیا تاکہ دشمنوں کو پیغمبر کی موجودگی پر شک نہ ہو سکے۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ عافیت غار میں قیام فرما ہو چکے

ردا اڑھ کر آپ کے بستر پر سونے کے لیے تیار ہوں، رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو گلے سے لگایا۔ اہل مکہ کی تمام امانتیں آپ کے سپرد کیں اور آپ کو اپنی جگہ اپنے بستر پر سلا کر ایک مٹھی خاک اٹھائی اور کفار مکہ کی آنکھوں میں جھونکتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر ہجرت اختیار کیا اور دوسری طرف حضرت علیؑ تمام خطرات سے بے نیاز سر سے پاؤں تک پیغمبر کی چادر تان کر بستر رسول پر سو گئے۔ جب خلاق کائنات نے یہ منظر دیکھا تو ملائکہ سے فرمایا،

”تم میں کچھ میرے بندے ایسے بھی ہیں جو میری خوشنودی کی

خاطر اپنی جان تک بیچ دیتے ہیں اور اللہ ایسے بندوں پر بڑا ہی مہربان

اور شفقت کرنے والا ہے“ (البقرہ - ۲۰۶)

احیاء العلوم میں امام غزالی تحریر فرماتے ہیں کہ شب ہجرت خدا نے جبریل اور میکائیل سے فرمایا کہ میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ قائم کیا اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ کی۔ اب بتاؤ، تم میں کون ایسا ہے جو اپنی عمر اپنے بھائی کو دے دے۔ مگر دونوں فرشتوں نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ رہے۔ تب خدا نے فرمایا کہ میں نے علیؑ اور محمدؐ میں اس رشتے کو قائم کیا ہے اور دیکھو علیؑ نے آج کی شب اپنی زندگی محمدؐ کو دے دی ہے اور دشمنوں کے زخموں میں بے خوف و خطر ان کے بستر پر محو خواب ہیں۔ تم دونوں ابھی زمین پر جاؤ اور علیؑ کی حفاظت کرو۔ خدا کے اس حکم سے دونوں فرشتے زمین پر آئے۔ جبریل حضرت علیؑ علیہ السلام کے سر ہانے اور میکائیل پانچٹی میٹھے اور علیؑ سے فرمایا کہ اے نفس پیغمبر! خداوند عالم آپ کے اس عمل پر فخر و مباہلا کرتا ہے۔ ”یہ وہ مدح ہے جس میں علیؑ کا کوئی سہم و شریک نہیں ہے“

الغرض حضرت علیؑ علیہ السلام بستر رسول پر شان بے نیازی کے ساتھ جبریل و

علی علیہ السلام رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آب و غذا پہنچاتے رہے۔
چوتھے روز مولائے کائنات جب کفار کی طرف سے مطمئن ہوئے تو عبد اللہ
بن ارقیط اور عامر بن فہیرہ کے ہمراہ سواری لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں غار سے نکال کر عبد اللہ بن ارقیط اور
عامر بن فہیرہ کے ہمراہ مع ابوبکر کے مدینہ روانہ کر دیا اور بعد میں آپ بھی
اہل مکہ کی امانتیں واپس کر کے عورتوں اور بچوں کے ہمراہ مدینہ روانہ ہو گئے
اور اس طرح خاندان نبوی کی ہجرت مکمل طور پر عمل میں آگئی۔

بانی اسلام کے بارے میں کفار قریش
جو نہ پوری ہو سکی وہ آرزو کرتے ہیں (ڈاکٹر حضور نواب)

غار ثور کی نوعیت

مکہ سے دہائی طرف تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلہ پر جبل ثور نامی پہاڑ کی
چوٹی پر گید نما ایک گول پتھر تھا جس میں قدرتی طور پر اندر خول تھا اور اس پتھر
میں ڈیڑھ بالشت لمبا اور ڈیڑھ ہی بالشت چوڑا سوراخ تھا جو در تھا خول
کے اندر صرف اتنی گنجائش تھی کہ ایک پستہ قد آدمی کھڑا ہو سکے، شب ہجرت پتھر
کے اسی خول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ اعجاز نبوت داخل ہوئے تھے
اس پہاڑ کی چوٹی سطح زمین سے ایک میل بلند ہے جہاں سے سمندر دکھائی دیتا
ہے۔ (تفہیم سیرۃ النبی ص ۱۶۹)

غزوات سے کنارہ کشی اور فرار

مخالفین اور مشرکین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو

تھے اور ادھر کفار مکہ ساری رات رسول کے گھر کا محاصرہ کیے، کبھی پنجوں پر کھڑے ہو کر
اور کبھی اچک اچک کر آنحضرت کے بستر کی نگہانی کرتے رہے۔ اسی عالم میں رات گزر
گئی اور جب صبح ہوئی تو سب کے سب دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور
چادر ہٹائی تو اوسان خطا ہو گئے۔ دشمنوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی
کہ بستر رسول پر علی ہیں۔ گھر آکر رسول اللہ کے بارے میں پوچھا تو حضرت علیؑ
نے فرمایا کہ کیا تم نے محمد کو میرے سپرد کیا تھا۔ طبری میں ہے کہ علی تلوار سونت کر
کھڑے ہو گئے اور سب گھر سے باہر نکل بھاگے۔

اپنی اس ناکامی کے بعد کفار نے آپس میں مشورہ کر کے یہ اعلان کیا کہ جو
شخص محمد کو زندہ پکڑ کر یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا اسے سوا نوٹ انعام میں دیے
جائیں گے۔ یہ اعلان سن کر بہت سے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
تلاش میں ادھر ادھر نکلے لیکن ناکام رہے۔ البتہ سراقہ بن مالک نام کا ایک
شخص کھوج لگاتا ہوا کسی طرح غارتگ جا پہنچا۔ اس کی آہٹ پر ابوبکر نے اپنے
کان کھڑے کیے اور جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ دشمن قریب تر ہے تو اس کو متوجہ
کرنے کے لیے آپ نے بہ آواز بلند بھول بھول رونا شروع کر دیا۔ یقیناً ابوبکر کا
یہ حبیب گرہ پیغمبر اسلام کو قتل کر دینے کے لیے کافی تھا، اگر خدا کا تحفظ نہ حاصل
ہوتا، پیغمبر نے ابوبکر سے فرمایا کہ روتا کیوں ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ ہے حضرت ابوبکر کا وہ کارنامہ جسے مولانا ندوی نے بہت عظیم فضیلت
سے تعبیر کیا ہے۔

یکم ربیع الاول ۳۲ھ بعثت کو پنجشنبہ کی شب میں کفار مکہ نے آنحضرت کے
گھر کا محاصرہ کیا، ۲ ربیع الاول یوم جمعہ کو آغاز سحر سے کچھ پہلے آنحضرت غار ثور
میں داخل ہوئے اور ۴ ربیع الاول یکشنبہ تک وہاں قیام فرما رہے اور حضرت

غالباً یہی سبب ہے کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اپنی کتاب المرتضیٰ میں بدر، احد، خندق اور خیبر کے واقعات بیان کرتے وقت خلفائے ثلاثہ میں سے کسی کا نام تک نہیں لیا۔ حالانکہ مولانا کا یہ فعل غلط دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ لیکن

نمک حلال کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں

بہر حال مجبوریاں کچھ سہی، مولانا ندوی کی تاریخی بددیانتی کا تقاضہ یہی ہے کہ بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین کے واقعات کو اجمالی تفصیل کے ساتھ دوبارہ تحریر کیا جائے تاکہ جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے۔

جنگ بدر

کفر اور اسلام کے درمیان جنگ بدر پہلی جنگ ہے جو ماہ رمضان ۲؎ میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا لشکر کل تین سو تیرہ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ صرف دو عدد گھوڑے تھے۔ ایک پر حضرت مقداد سوار تھے، دوسرا مرثد کی سوار کی میں تھا، باقی لوگ پیل تھے۔ کل چھ مجاہدین کے پاس زرہیں تھیں باقی سب لوگ بغیر زرہ کے تھے۔ دوسری طرف لشکر کفار میں زرہ پوش اور ہتھیار بند سوار تھے۔ لشکر اسلام کی علم برداری حضرت علیؑ کے سپرد تھی۔

جنگ کا حال مورخین نے یوں بیان کیا ہے کہ کفار مکہ کا ایک قافلہ ابوسفیان اور عمرو عاص کی قیادت میں سامان تجارت لے کر شام سے مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ یہ خبر آنحضرتؐ کو دی گئی اور جہاد کا حکم ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں کا مختصر سا لشکر آنحضرتؐ کی سربراہی میں ان کافروں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ ابوسفیان کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ گھبرا یا اور اس نے مکہ سے کفار کو اپنی مدد کے لیے

دفاعی لڑائیاں لڑیں ان کی تعداد بائیس تھ ہے۔ جن لڑائیوں میں سرور کائنات نے اپنے باوفا اصحاب میں سے کسی کو فوج کا سردار بنا کر بھیجا انھیں سریہ کہا جاتا ہے۔ سریوں کی کل تعداد چھتیس ہے، جن میں موت بہت مشہور جنگ ہے اور اس جنگ میں حضرت جعفر طیار کی شہادت واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ جن جنگوں میں سرکارِ دو عالمؐ پر نفس نفیس شریک ہوئے انھیں غزوہ کہتے ہیں۔ غزوات کی مجموعی تعداد چھبیس ہے۔ جن میں بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین کی جنگیں مشہور آفاق ہیں۔ ان تمام جنگوں میں خلفائے ثلاثہ کی شرکت اور ان کا میدان چھوڑ کے بھاگنا تاریخ کی ہر مستند اور معتبر کتاب سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی میدانِ جنگ سے راہ فرار اختیار کرنے والوں کو قرآن میں جہنمی قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ:-

”جب تم کفار سے میدان جنگ میں لڑو تو ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرو اور جو شخص بھی دوران جنگ کفار کی طرف پیٹھ پھیرے گا وہ یقیناً خدا کے قہر و غضب میں آئے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور یقیناً وہ بہت برا ٹھکانا ہے“ (انفال - ۱۶)

سورہ توبہ میں ارشاد فرمایا کہ:-

”کیوں قتال نہیں کرتے تم اس قوم سے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور رسولؐ کے نکالنے کا ارادہ کر لیا اور انھیں لوگوں نے تمھارے ساتھ ابتدا کی، آیا تم ان لوگوں سے ڈرتے ہو، پس اگر تم مومن ہو تو اللہ زیادہ مستحق ہے کہ تم اُس سے ڈرو“ (سورہ توبہ - ۱۳، ۱۴)

مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ میدان سے بھاگنا نفاق کی علامت ہے۔ مولوی عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوة میں تحریر فرمایا ہے کہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنا کفر ہے۔

جنگ احد

یہ جنگ ۱۵ شوال ۳ھ کو ہوئی۔ اس کی روداد یہ ہے کہ جنگ بدر کی شکست سے کفار مکہ کے دلوں میں غم و غصہ اور انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ابوسفیان نے مقتولین بدر کے ورثاء کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی عورتوں کو روکنے نہ دیں ورنہ آنسو نکلنے سے غم و غصہ کم ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ جنگ بدر کا بدلہ لینے کی غرض سے ابوسفیان تین ہزار سواروں، دو ہزار پیادوں اور مقتولین بدر کی عورتوں کے ہمراہ مکہ سے نکلا اور مدینہ سے چار میل کے فاصلے پر کوہ احد کے دامن میں خیمہ زن ہو گیا۔

یہ خبر پیغمبر کو موصول ہوئی تو آپ بھی ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلہ کو نکلے اور میدان میں پہنچ کر آپ نے عبداللہ بن جبیر کو پچاس تیر اندازوں پر مشتمل ایک دستے کا افسر معین کیا اور اس بات کی سخت تاکید فرمادی کہ لشکر اسلام کو خواہ فتح حاصل ہو یا شکست لیکن تیر اندازوں کا یہ دستہ اپنی جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹے گا۔ اس ہدایت کے بعد آنحضرت نے اسلامی لشکر کو کفار کے مقابلہ میں صف آرا کیا اور رفتہ رفتہ معرکہ کارزار گرم ہونے لگا۔ مسلمانوں کے سخت حملوں نے دشمنوں کے حوصلے پست کر دیے اور اسلامی فوج عنقریب کامیابی سے ہلکنار ہونے ہی والی تھی کہ عبداللہ ابن جبیر کا دستہ مال غنیمت کی لالچ میں پیغمبر کے تاکید ہی حکم کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹ گیا اور جس کا انجام ہوا کہ حاصل ہوتی ہوئی فتح اور کامرانی شکست میں تبدیل ہو گئی اور میدان میں بھگڑ چکے گئے۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ تو اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کہ انھوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا گذر رہی

طلب کیا۔ جب مکہ والوں میں یہ خبر عام ہوئی تو وہاں ایک کھرام چچ گیا۔ ابوجہل نے یہ منادی کرادی کہ ابوسفیان اور اس کے ہمراہی سب خطرے میں ہیں اور تم میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کا مال اس قافلے میں نہ ہو۔ اس منادی کے ہوتے ہی کفار مکہ بڑے ساز و سامان کے ساتھ ایک لشکر لے کر ابوسفیان کی مدد کو روانہ ہوئے۔ ابوسفیان اپنی چالاکی سے عام راستے سے ہٹ کر، کسی دور سے راستے سے مکہ کی طرف نکل گیا اور مکہ سے آئے ہوئے لشکر کی مسلمانوں سے ٹکرائی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں ہی اپنی بزدلی کی وجہ سے اس جنگ کے مخالف تھے اور مسلمان بھی اپنی قلت پر گھبرا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب سے مشورہ کیا۔ سعد بن معاذ اور مقداد وغیرہ نے عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا، اور کہا کہ ہماری جانیں اللہ اور اس کے رسول کے لیے وقف ہیں ہم جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اپنے ثبات قدم سے چکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ غرض کہ جنگ کی ٹھہری کفار کا لشکر ایک ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا لیکن اللہ نے مسلمانوں کی مدد کی اور دشمنوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ کفار کے سر آدمی قتل ہوئے اور سر بھی قید ہوئے۔ قیدیوں میں نصر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط قتل کر دیے گئے۔ باقی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اس جنگ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے تنہا چھتیس کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور ابوجہل، اس کا بھائی عاص اور عقبہ، شیبہ، ولید بن عقبہ و نیز اسلام کے بہت سے دشمن مارے گئے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ اس جنگ میں موجود تھے مگر نہ جانے کہاں روپوش تھے کہ انھوں نے جنگ ہی نہیں کی، اس جنگ کے بعد کفار کا ہر ایک گھر ماتم کہہ بن گیا اور مقتولین کے انتقام کا جذبہ کہہ کے ہر پیر و جوان میں پیدا ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں احد کا معرکہ ہوا۔

ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ساتھ حضرت عثمان بھی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ درمنثور ج ۲ ص ۸۸ اور کنز العمال ج ۱ ص ۲۳۸ میں ہے کہ ابوبکر بھاگ کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ اور خود حضرت ابوبکر کا کہنا ہے کہ میں پہاڑ کی چوٹی پر اس طرح اچک رہا تھا جیسے پہاڑی بکری اچکتی ہے۔

اس جنگ میں شہر مسلمانوں کے ساتھ حضرت محمدؐ بھی شہید ہوئے اور معاویہ کی ماں ہندہ نے آپؐ کا کلیجہ نکال کر چایا۔ امیر المومنین حضرت علیؑ علیہ السلام کے جسم اقدس پر سولہ زخم آئے اور آپؑ کا ایک ہاتھ بھی ٹوٹا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی زخمی ہوئی اور آپؐ کے دو دانت شہید ہو گئے۔ اسی جنگ میں امیر المومنین کو لافتنی الآ علی کی سند کے ساتھ ذوالفقار عطا ہوئی اور ایک روایت کے مطابق ناد علی کا نزول بھی اسی جنگ میں ہوا۔ (طبری ج ۲ ص ۶۰۶، تاریخ کامل ج ۲ ص ۴۴)

جنگ خندق

یہ جنگ ماہ ذیقعدہ ۵ھ میں ہوئی۔ اس جنگ کو غزوہ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ مدینہ سے جلا وطن کیے ہوئے یہودی جو خیبر کے آس پاس سکونت پذیر ہو گئے تھے، رات دن اسی فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں سے کیونکر بدلہ لیا جائے چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ مکہ گئے اور ابوسفیان سے مل کر، قبیلہ بنی غطفان اور دیگر قبائل کے ساتھ رشتہ اخوت قائم کیا جس کے نتیجہ میں یہودیوں اور مختلف قبائل کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ تمام قبیلوں کے بھادر اور سوار مال کر مدینہ پر ایک ساتھ حملہ کر کے اسے برباد و تاراج کر دیں کہ جس سے اسلام کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

اس معاہدہ کے تحت، ابوسفیان مکہ سے چار ہزار کا لشکر لے کر نکلا،

اور یہودیوں نے دیگر قبائل کے ساتھ چھ ہزار کے لشکر سے پیش قدمی کی۔ غرض کہ دس ہزار کا یہ جم غفیر مدینہ پر حملہ کی نیت سے آگے بڑھا۔ پیغمبر اسلام بھی مدینہ سے نکلے اور کوہ سلع کو پشت پر لے کر جناب سلمان فارسی کے مشورہ سے پندرہ فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ گہری ایک خندق کھدوائی۔ خندق کی آبی ہوا حضرت خود بھی کمال جاں فشانی اور محنت کے ساتھ لگے رہے۔

اس جنگ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں بھی جاری تھیں اور اندرونی خلفشاً بھی تھا۔ جلال الدین سیوطی کا کہنا ہے کہ تحفظ کے پیش نظر آنحضرتؐ نے دشمنوں کی نقل و حرکت کی خبر گیری کے لیے ابوبکر اور عمر کو مامور کرنا چاہا مگر انھوں نے صفات انکار کر دیا تو آپؐ نے حذیفہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ (درمنثور ج ۵ ص ۱۷۱) خندق کی تیاری کے تیسرے ہی دن کفار کا لشکر آدھکا اور دشمنوں کی کثرت دیکھ کر مسلمانوں میں تشویش کے آثار نمایاں ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ثابت قدمی کی ہدایت فرمائی اور ان کے حوصلوں کو بلند کیا۔ جلال و ہیبت پیغمبری سے دشمنوں میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ یکبارگی حملہ کی ہمت و جسارت کرتے۔ اس کے علاوہ بھی دشمنوں کو اس امر کا بخوبی علم تھا کہ لشکر اسلام میں علیؑ ایسا تلوار کا دھنی، شجاع اور بہادر موجود ہے۔ اس لیے اکاؤنٹ کا خندق پار کر کے مسلمانوں پر حملہ کی کوشش کرتا رہا اور یہ سلسلہ ساتیس دن تک برابر جاری رہا۔ آخر کار عمرو بن عبید و جو طاقت اور بہادری میں تنہا ایک ہزار جوانوں کے برابر سمجھا جاتا تھا ایک دن خندق پھانڈ کر خود ہی مقابلے میں آگیا اور اس نے ہل من مبارز کی صدا بلند کی۔ عمرو بن عبید و کی آواز سن کر حضرت ابوبکر اور عمر کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ خوف و دہشت کے مارے تھر تھرانے لگے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس دیوبکر سے کون لڑ سکتا ہے جو ایک ہزار قزاقوں سے تنہا مقابلہ کرتا ہے۔ خدا کی قسم

دکھائی دیتی تھیں، اس کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ حضرت علیؑ نے جب نعرہ تکبیر بلند کی تو مسلمانوں کو اطمینان ہوا کہ عمرو بن عبدودؓ نے علیؑ کو غالب آگئے۔ پیغمبر اسلامؐ نے عمرو بن عبدود کے قتل کی خبر سنی تو فرمایا کہ آج کے دن علیؑ کی ایک ضربت عبادتِ تقیین سے بہتر ہے۔

عمرو بن عبدود کے قتل ہوتے ہی اس کے تمام ساتھی خندق پھانڈ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر کیا تھا، حضرت علیؑ نے کفار کے لشکر میں گھس کر دشمنوں کو تلوار کی بارٹھ پر لے لیا اور یہ جنگ اللہ کی مدد اور علیؑ کی قوت سے سر ہوئی۔ اس جنگ میں حضراتِ شہین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنے جسم پر ایک خراش تک نہ آنے دی۔ (تاریخ احمدی ص ۵۰ و سیرۃ محمدیہ ج ۲ ص ۱۰۲) بعض کتابوں میں ہے کہ عمرو بن عبدود کے سینے پر چڑھ کر حضرت علیؑ اس کا سر کاٹنا چاہتے تھے کہ اس نے لعابِ دہن سے چہرہ اقدس پر بے ادبی کی۔ حضرت کو غصہ آگیا لیکن آپؐ یہ سوچ کر فوراً سینے سے اتر آئے کہ کارِ خدا میں جذبہ نفس شامل ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب غصہ فرو ہوا تو آپؐ نے سر کاٹا اور زرہ اتارے بغیر رسالتِ مآب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے علیؑ کو سینے سے لگایا۔ بروایت سلمانؓ قندوزی جبریلؓ امین نے آسمان سے انار لاکھ تحفہ عنایت کیا۔ انار کے ساتھ ایک سبز رنگ کا رومال بھی تھا جس پر ”علیؑ و بیؑ اللہ“ لکھا تھا۔

جنگِ خیبر

یہ جنگ ۶۲۷ء میں ہوئی۔ خیبر مدینہ منورہ سے تقریباً پچاس میل کی دوری پر واقع ہے۔ اس جنگ کا واقعہ یہ ہے کہ وہاں کے سرکش یہودیوں نے باہم متحد ہو کر قبیلہ بنی اسد اور بنی غطفان کی مدد سے مدینہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا

میں ایک سفر میں ایک بار اس کے ساتھ تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے قافلے پر رات کے وقت حملہ کر دیا۔ عمرو بن عبدود اس وقت سو رہا تھا، اسے جگایا گیا، جلدی میں اسے ڈھال نہ مل سکی تو ڈھال کی جگہ اس نے اونٹ کا ایک بچہ اٹھالیا اور قزاقوں پر حملہ کر کے انھیں بھگا دیا۔

حضرت عمرؓ کے اس بزدلانہ بیان نے مسلمانوں کو اور بھی خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ نے لشکرِ اسلام کو مخاطب کر کے مقابلہ کی سمیت دلائی لیکن ایک بہادر نوجوان کے علاوہ کوئی نہ سنا۔ تاریخِ مخمس، روضۃ الاحباب اور روضۃ الصفا میں ہے کہ تین بار آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ (ابوبکر اور عمرو وغیرہ) سے مقابلہ کے لیے کہا، لیکن یہ لوگ چپ رہے اور ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بزدلوں کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں۔ صرف ایک علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر بار بار لبیک کہہ رہے تھے۔

جب صحابہ میں کوئی تیار نہ ہوا تو پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ کو اجازت دی اور انھیں اپنی زرہ پہنا کر اپنا عمامہ ان کے سر پر رکھا۔ اپنی تلوارِ مرحمت کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر فرمایا کہ پالنے والے، جنگِ بدر میں عبیدہ اور جنگِ احد میں حمزہ کو تیری بارگاہ میں نذر کر چکا ہوں اور اب میرے پاس صرف علیؑ رہ گئے ہیں، مالک! تو ان کی صفاتِ فرما، اور جب علیؑ مرتضیٰ آپؐ کی دعاؤں کے سائے میں عمرو بن عبدود سے جنگ کے لیے چلے تو آپؐ نے فرمایا کہ دیکھو! آج کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔ (حیوة الحیوان ج ۱ ص ۲۳۸ و سیرۃ محمدیہ ج ۲ ص ۱۰۲)

حضرت علیؑ علیہ السلام عمرو بن عبدود کے مقابل ہوئے اور جنگ شروع ہوئی، عالم یہ تھا کہ گردوغبار کے پردے میں صرف دو تلواریں تھیں جو چمکتی ہوئی

جانب ملققت ہو جائے اور پیغمبرؐ نے ملنے والی یہ سعادت ان کے ہی حصہ میں آجائے اس لیے ان لوگوں نے بے خوابی کے عالم میں کسی طرح رات کاٹی اور جب صبح ہوئی تو سرداری کا حوصلہ دل میں لیے رسولؐ کے خیمہ کا طواف کرنے لگے کہ علم مل جائے۔ لیکن اس وقت ان کا یہ سنہرا خواب چلنا چور ہو گیا جب زبان رسالت آپؐ پر حضرت علیؑ کا نام آیا۔ فوراً بڑھ کر ایک نے کہا کہ حضور! علیؑ تو آشوب چشم میں مبتلا ہیں وہ جنگ کیوں کر کر سکتے ہیں؟ ابھی یہ جملہ ناتمام ہی تھا کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام خدمت رسولؐ میں آتے دکھائی دیے۔ پیغمبرؐ نے امیر المومنین کو بڑھ کر گلے لگایا اور آپؐ کا سراپے زانو پر رکھ کر آپؐ کی آنکھوں میں اپنا لعاب دھن لگایا جس سے آپؐ کا آشوب چشم جاتا رہا اور بخار بھی اتر گیا۔ اس کے بعد رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے علم حضرت علیؑ کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ جا کر قلعہ قوص کو فتح کر دو۔ امیر المومنین نے دریافت فرمایا کہ کب تک جنگ کروں، رسولؐ نے فرمایا کہ جب تک قلعہ قوص فتح نہ ہو جائے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام اپنی سابقہ شان شجاعت کے ساتھ میدان میں آئے اور علم کو ایک پتھر پر گاڑ دیا۔ یہ منظر ایک یہودی دیکھ رہا تھا اس نے بڑھ کر امیر المومنین سے آپؐ کا نام دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں علیؑ ابن ابی طالب ہوں۔ یہ سننا تھا کہ وہ یہودی اپنی جان لے کر بھاگا اور قلعہ میں پہنچ کر یہودیوں سے بولا کہ خدا کی قسم آج ہم سب مارے جائیں گے کیونکہ اس قلعہ کے فاتح کے جو اوصاف توریت میں بیان ہوئے ہیں وہ سب علیؑ میں موجود ہیں۔

الغرض جنگ چھڑی اور معرکہ کارزار گرم ہوا۔ حارث، مختر، ربیع اور

چنانچہ یہودیوں کے اس منصوبہ کا علم رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوا تو آپؐ چودہ سو پیادوں اور دو سو سواروں کا ایک لشکر لے کر ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۴ ہجری کو خیبر میں پہنچ کر اس کا محاصرہ کیا۔ خیبر میں یہودیوں کی جو سب سے بڑی پناہ گاہ تھی وہ قلعہ قوص کے نام سے مشہور ہے۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس جنگ میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ پر بھی مردانگی سوار ہوئی اور یہ لوگ بھی میدان کارزار میں گئے، لیکن مرحب و مختر وغیرہ نے انھیں دوڑایا تو بہادری اور مردانگی کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ حضرت عمرؓ دو بار مقابلہ کے لیے نکلے۔ لیکن جب کھد پڑے گئے تو آپؐ نے بھاگ کر سیدھے اپنے خیمہ میں دم لیا۔ متذکر حاکم، تاریخ طبری ج ۳ ص ۹۳ تاریخ احمدی ص ۵۹ اور شواہد النبوة ص ۸۵ وغیرہ میں مرقوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی اس کھسیا ہٹ کے تحت لشکر اسلام کو بزدل قرار دیا اور لشکر اسلام نے انھیں بزدل ٹھہرایا۔

رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دوران درد شقیقہ میں مبتلا تھے اور اپنی اس ناسازی طبع کی بنا پر اپنے خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ میدان جنگ مسخروں اور بھگوروں کی آماجگاہ بننا جا رہا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں کل اپنے ہاتھوں سے علم اس کو دوں گا جو کہار اور غیر فرار ہوگا اور وہ خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ وہ دشمنوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہوگا اور میدان جنگ سے اس وقت تک نہ پلٹے گا جب تک قلعہ قوص فتح نہ ہو جائے۔

رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلان سے بزدلوں اور بھگوروں کے دلوں میں اس خواہش نے سراٹھایا کہ شاید رسولؐ کی نگاہ انتخاب ان کی

مرحوب جیسے نامی و گرامی پہلوان ذوالفقار حیدری کی زد میں آئے اور موت کے گھاٹ اتر گئے۔ بالآخر یہودیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور بھاگتے بھاگتے ایک یہودی نے امیر المومنین کے ہاتھ پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ڈھال آپ کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ شیر ذوالجلال کو جلال آیا اور آپ نے قلعہ کے آہنی دروازہ پر اپنا بایاں ہاتھ رکھ کر زور دیا تو انگلیاں باب خیر میں اس طرح دھڑکیں کہ جس طرح موم میں لوہا در آتا ہے۔ وہ دروازہ جسے چالیس پہلوان مل کر جنبش نہ دے سکتے تھے، ایک جھٹکے میں ہاتھوں پر اس طرح آگیا کہ جیسے کوئی شاخ سے پھول توڑے۔

در خیر کو آپ نے ڈھال کی جگہ استعمال کر کے دشمنوں سے جنگ کی اور پھر اسی کا پل بنا کر اسلام کی فوج کو قلعہ کے اندر داخل کیا جس کے نتیجہ میں یہودیوں کو شکست ہوئی اور لشکر اسلام ظفریاب ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام قلعہ قوص فتح کرنے کے بعد کامیابی و کامرانی کا تاج پہنے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس چلے۔

روضۃ الصفار میں باب خیر کا وزن تین ہزار من بتایا گیا ہے۔ چونکہ اس در کا اکھاڑ ناقوت انسانی سے باہر تھا اس لیے امیر المومنین نے یہ وضاحت بھی فرما دی تھی کہ میں نے باب خیر کو قوت ربانی سے اکھاڑا ہے۔

طبری ج ۲ ص ۹۳ میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ سرداری کا جیسا حوصلہ مجھے خیر میں ہوا، ایسا کبھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔

نوٹ :- تاریخ کی کتابوں میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ کسی جنگ کے موقع پر رسول خداؐ نے حضرات شیخین کے سپرد علم کیا ہو۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ میدان کارزار میں علم اس کو دیا جاتا ہے جو فن حرب میں تہارت اور میدان جنگ کا تجربہ رکھتا ہو۔ بھلا شیخین کو فن حرب سے کیا تعلق؟ جبکہ حضرت ابو بکر ایک معمولی بزاز

کے بیٹے اور حضرت عمر ایک غریب و مزدور پیشہ لکڑہارے کے فرزند تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ رہبر کی غرض سے خیر میں بزم خود علم لے بھاگے ہوں اور مرحوب وغیرہ نے کھدیر کو انہیں خیمہ تک پہنچا دیا ہو۔ (واللہ اعلم)

جنگ حنین

یہ جنگ ۶ شوال ۶۰۰ھ میں لڑی گئی۔ حنین ایک وادی کا نام ہے جو مکہ سے طائف کی سمت تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس جنگ کا تاریخ میں ایک اہم مقام ہے لیکن مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اس جنگ کا تذکرہ اپنی کتاب میں نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ اس جنگ کے حالات بیان کرنے سے وہ راز ہائے سرستہ منکشف ہوتے ہیں جنہیں مولانا ندوی نے پردے میں چھپانا چاہا ہے اور ان لوگوں کا فرار ثابت ہوتا ہے جو سیف اللہ کہہ جاتے ہیں۔ لہذا فردی ہے کہ اس جنگی تسلسل کے آخر میں اس جنگ کی بھی اجمالی تفصیل پیش کی جائے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔ اس جنگ کا واقعہ یہ ہے کہ:-

فتح مکہ کے بعد، قبیلہ بنی حشم، بنی سعد، بنی ہوازن اور بنی ثقیف وغیرہ نے ایک اجاع میں یہ فیصلہ کیا کہ سب مل کر مسلمانوں پر حملہ کریں۔ اس تجویز کے بعد سب قبیلوں نے متفقہ طور پر اپنا سردار مالک بن عوف کو مقرر کیا اور لشکر کی علمبرداری ابو جریول کے سپرد کی گئی اور یہ لوگ پانچ ہزار کا ایک لشکر لے کر حنین اور طائف کے درمیان اوطاس کے مقام پر جمع ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ہزار کے لشکر کے ہمراہ جس میں ڈو ہزار نو مسلم بھی شامل تھے مقابلہ کے لیے نکلے۔ حسب معمول حضرت علیؑ اسلامی لشکر

پلٹ کر آیا اور دشمن بھی پہاڑوں سے نکل کر مقابل ہو گئے۔ گھسان کی جنگ ہوئی ابو جہول جو کفار کے لشکر کا علمبردار تھا، حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا قتل ہونا تھا کہ مسلمانوں کے حوصلے یک بارگی بڑھ گئے اور آخر کار اللہ نے حضرت علیؑ کے توسل سے اس جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کی۔

یہ ہیں حضرات ابو بکر اور عمر وغیرہ کے قابل فخر جنگی کارنامے جو تاریخی حیثیت سے مستند اور مسلم ہیں۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی یا ان کے ملک کے حضرات اپنے ان مذہبی پیشواؤں اور دینی مقتداؤں کے ان کارناموں پر جس قدر بھی ناز فرما میں بجا

صلح حدیبیہ اور ابو بکر کی گالیاں

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب میں صلح حدیبیہ کے حالات کی تفصیل بیان کرتے وقت حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ کی موجودگی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ ان کی اس گفتگو کو بیان کیا ہے جو تاریخ ساز بھی ہے اور دل چسپ بھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اختصار کے ساتھ ان واقعات کو پیش کر دوں جنہیں مولانا نے قصداً نظر انداز کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

ماہ ذیقعدہ ۶ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے لیے روانہ ہوئے اور راستے میں ایک کنوئیں کے پاس قیام فرمایا جس کا نام حدیبیہ تھا۔ وہاں آپ نے اپنے تمام اصحاب سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ اسی بیعت کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے اور بیعت کرنے والوں کو اصحاب سمرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے لیے مکہ کا ماحول سازگار نہیں تھا اس لیے قریش کے خصوصی اہلچلچلے نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ اس سال آپ حج سے باز آئیں۔ اول تو مکہ کا ماحول درست نہیں ہے۔ دوسرے میں آپ کے گرد ایسے غلط اور

کے علمبردار تھے۔ جب لشکر میدان میں پہنچا تو حضرات شیخین کو اپنی کثرت اور دشمنوں کی قلت پر ایسا گھمنڈ ہوا کہ فرمانے لگے، آج ہم تعداد میں اس قدر ہیں کہ دشمنوں کو بیس کر رکھ دیں گے۔

شیخین کا یہ غرور اور گھمنڈ شاید اللہ کو بھی ناگوار گذرا اور ابھی یہ دونوں برادران اپنی کثرت پر ناز فرما ہی رہے تھے کہ پہاڑوں میں چھپے ہوئے دشمنوں نے تیروں اور پتھروں سے اچانک حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ بزدلوں کو جان کے لالے پڑ گئے اور ان کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ جنگ کی باطالت سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنوں میں چھوڑ کر اس طرح بھاگنے کو پڑا کہ بھی نہ دیکھا۔ رسول اللہ آواز ہی دیتے رہے کہ اے بیعت رضوان والو! کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ لیکن پیغمبر اسلام کی یہ آواز صدائے بازگشت کی طرح گونجتی رہی اور بھاگنے والے بھاگتے رہے۔

حبیب السیر اور روضۃ الاحباب میں ہے کہ بھاگنے والوں میں سب سے پہلے خالد بن ولید (سیف اللہ) بھاگے، ان کے پیچھے نو مسلم تھے۔ ان کے پیچھے ابو بکر، ان کے پیچھے عمر اور عثمان وغیرہ، ان کے پیچھے انصار و مہاجر بھاگے۔ غرض کہ بزدلوں کی یہ میل ٹرین بزدلی کی پٹری پر تیزی سے بھاگ رہی تھی اور خالد بن ولید جنہیں سیف اللہ کہا جاتا ہے انجن کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ الغرض رسول اسلام کے تحفظ میں علی بن ابی طالبؓ، عباسؓ، زید بن حارث اور ابن مسعود کے علاوہ کوئی نہ ٹھہرا۔ (سیرت جلد ۳ ص ۱۰۹)

حالات کی نزاکت کے پیش نظر رسول اللہ نے یہ ذات خود جنگ کا ارادہ کیا لیکن عباس نے بڑھ کر لجام فرس تھام لی اور بھاگتے ہوئے لوگوں کو پکار پکار کر انھیں شرم و غیرت دلائی۔ عباس کی آواز پر تقریباً سو آدمیوں کا ایک دستہ

ادبائش لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو وقت پڑنے پر آپ کو چھوڑ کے بھاگ جائیں گے
عروہ چونکہ شیخین کی بزدلی سے باخبر تھا اس لیے اس کا یہ مشورہ کسی حد
تک درست بھی تھا لیکن حضرت ابو بکر کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی اور وہ
آپ سے باہر ہو گئے اور آپ نے گالیوں کی بوچھاڑ شروع
کر دی۔ فرمایا کہ جا اور جا کہ اپنے معبود (لات و ہبل) کی شرمگاہ چوس اور اس
کے نظر آلات کا مزہ لے۔ کیا ہم ایسے ہیں کہ رسول کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

(تحریر بخاری، حدیث ۸۹۷، شرح زر قانی ص ۲۱۹ اور روضۃ الاحباب ص ۲۱۵ وغیرہ)
حضرت ابو بکر کے اس طرز عمل سے واضح ہے کہ آپ گالیوں کے ایسے مجتہد
تھے کہ آپ کو پیغمبر کی موجودگی کا بھی کوئی ادب، احترام یا لحاظ نہیں تھا۔

تاریخ ابن اثیر میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار مکہ سے
مصالحانہ گفتگو کی غرض سے ابو بکر اور عمر کو مکہ روانہ کرنا چاہا لیکن ان لوگوں نے جانے
سے انکار کیا تو آپ نے عثمان کو بھیجا۔ حضرت عثمان چونکہ ابوسفیان کے بھتیجے تھے
اس لیے کفار سے انھیں کوئی خطرہ نہیں تھا لہذا وہ گئے اور گفتگو کے بعد مصالحت
کا معاہدہ ضابطہ تحریر میں آیا لیکن اس کی صورت یہ نہیں تھی جسے مولانا ندوی نے
ظاہر کیا ہے۔

تاریخ خفیس ج ۱ ص ۱۵ اور درنثور ج ۲ ص ۷۷ میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے
موقع پر حضرت عمر نے فرمایا کہ محمد کی نبوت میں جیسا شک آج مجھے ہوا، اس سے
پہلے کبھی نہیں ہوا۔

حضرت عمر کے اس قول ہی سے ظاہر ہے کہ وہ محمد کی نبوت کو ہمیشہ
شک کی نظروں سے دیکھا کیے لیکن حدیبیہ میں موصوف کاشیک شاید ان کی یقین
کی منزلوں میں داخل ہو چکا تھا۔ جب کہ قرآن کا یہ حکم ہے کہ رسول اللہ صلعم کی

کی رسالت پر شک کرنے والا کافر اور رسول اللہ کو صدمہ پہنچانے والا جہنمی ہے۔
ابن خلدون کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے اس طرز عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
علیہ وسلم اور کبیدہ خاطر ہوئے۔ (۱۰۰) (ابن خلدون ص ۳۶)

ابو بکر سے رسول اللہ کی بیزاری

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ وقت آخر آنحضرت نے مجھ سے فرمایا کہ میرے
حبیب کو بلاؤ، میں نے اپنے باپ ابو بکر کو بلایا جب وہ آئے تو آپ نے ان کی
طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور ان سے کوئی کلام نہیں کیا۔ پھر فرمایا کہ میرے
حبیب کو بلاؤ، دوسری بار میں نے عمر بن خطاب کو بلایا آپ نے ان سے بھی
کوئی کلام نہ کیا اور جب تیسری بار پھر فرمایا تو میں نے علی ابن ابی طالب کو بلایا
جب وہ آئے تو آپ نے انھیں اپنی چادر میں لے لیا اور وقت آخر تک انھیں
اپنے سینے سے لگائے رہے۔ (۱۰۱) (ابن النضر ص ۱۸۰)

روضۃ الاحباب ج ۱ ص ۵ تاریخ بغداد ص ۲۹۰ اور مدارج النبوة ج ۲
ص ۵۱۱ میں مرقوم ہے کہ آنحضرت نے سیدہ اور حسنین کو بھی طلب فرمایا تھا اور
انھیں یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد تمھیں سخت مصائب و آلام کا سامنا ہوگا
مگر تم صبر کرنا اور جب اہل دنیا، دنیا پرستی کریں تو تم دین اختیار کیے رہنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت

المرتضیٰ کے فاضل مولف مولانا ندوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کی افسوس ناک شہادت کو وفات سے تعبیر کیا ہے جبکہ الوافی ج ۱ ص ۶۶ بحوالہ
تہذیب الاحکام، سر العالمین طبع مطبعہ ممبئی ۱۳۱۲ھ ص ۷، صحیح بخاری مطبوعہ

حسنینؑ کے وہ آپ کی محبت کا مرکز بننے لگے مگر ان کی گود اولاد سے ہمیشہ ہی خالی رہی اور ماں بننے کی آرزو کو اپنے بھانجے کے نام پر اپنی کنیت ام عبداللہ رکھ کر پورا کر لیا۔ غرض یہ سب چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے عائشہ کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا جس کے تقاضے سے مجبور ہو کر آپ جناب سیدہ کے خلاف پیغمبر سے شکوہ و شکایت بھی کرتی رہتی تھیں۔ مگر آنحضرتؐ کی توجہات ان کی طرف سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس رنج و کشیدگی کا تذکرہ حضرت ابو بکر کے کانوں میں بھی برابر پہنچا رہتا تھا جس سے وہ دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتے رہتے تھے۔ مگر ان کے کیے بھی کچھ نہ ہو پاتا تھا سوا اس کے کہ ان کی زبانی ہمدردیاں اپنی بیٹی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام کو دنیا سے رخصت کیا گیا اور حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی۔ اب موقع تھا کہ وہ جس طرح چاہتے انتقام لیتے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے اور جوتشدد چاہتے فاطمہؑ زہراؑ کے لیے روا رکھتے۔ چنانچہ پہلا قدم یہ اٹھایا کہ جناب سیدہ کو محروم الارث قرار دینے کے لیے آپ نے پیغمبروں کے درخت کی نفی کر دی کہ نہ وہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ان کا کوئی وارث ہوتا ہے بلکہ ان کا ترکہ حکومت کی ملکیت ہوتا ہے۔ ابو بکر کے اس طرز عمل سے جناب فاطمہؑ الہیہ اس قدر متاثر ہوئیں کہ آپ نے ترک کلام کر دیا اور انھیں تاثرات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ حضرت عائشہ نے اس موقع پر بھی اپنی روش نہ بدلی اور یہ تک گوارا نہ کیا کہ ان کے انتقال پر افسوس کا اظہار کرتیں۔ چنانچہ ابن ابی الحدید کا کہنا ہے کہ ”جب حضرت فاطمہؑ زہراؑ نے رحلت فرمائی تو تمام ازواج پیغمبر بنی ہاشم کے یہاں تعزیت کے لیے پہنچ گئیں ہوا عائشہ کے کہ وہ نہ آئیں اور یہ ظاہر کیا کہ وہ مریض ہیں اور ان کی طرف سے حضرت علیؑ کے کانوں میں ایسے الفاظ پہنچے جن سے ان کی مسرت و شادمانی کا پتہ چلتا ہے

(شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۵۹)

ج ۳ باب اللہود، کتاب الطب اور مشکوٰۃ شریف باب ۳ ص ۵۸ وغیرہ میں موجود ہے کہ مدینہ میں دوران علالت پیغمبر اسلام کو بستر علالت پر ہی زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

زہر دینے والا کون تھا؟ اس کی صراحت مذکورہ کتابوں میں نہ جانے مصلحت کی بنا پر نہیں کی گئی یا نہیں رہ گئی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ دوران علالت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر مرض حضرت عائشہ کے قبضہ میں تھا، جیسا کہ انگریز مورخ اور ادیب مسٹر گن کا کہنا ہے کہ: ”رسول کا بستر عائشہ جیسی چالاک عورت کے محاصرے میں تھا جو ابو بکر کی بیٹی اور علیؑ کی سخت دشمن تھیں“ (تاریخ سروج و زوال سلطنت روم ص ۹۲۸) حضرت عائشہ کا رویہ یقیناً امیر المومنین سے ہمیشہ معاندانہ رہا اور اکثر ان کے دل کی کدورت ان کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی اور ان کے طرز عمل سے نفرت و بیزاری جھلک اٹھتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر کسی واقعہ کے سلسلے میں حضرت علیؑ کا نام آجاتا تو ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس نفرت و عناد کا ایک خاص سبب جناب فاطمہؑ زہراؑ کا وجود بھی تھا جن کی ہمہ گیر عظمت و توقیر ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور سوتا پے کی جلن یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ پیغمبر اسلام، سوت کی دختر کو اس طرح چاہیں کہ اسے دیکھتے ہی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اپنی مسند پر جگہ دیں اور سیدۃ النساء العالمین کہہ کر دنیا کی تمام عورتوں پر اس کی فوقیت ظاہر کریں اور اس کی اولاد کو اس حد تک عزیز رکھیں کہ انھیں اپنا فرزند کہہ کر پکاریں۔ یہ تمام چیزیں حضرت عائشہ پر شاق گذرنے والی تھیں اور فطری طور پر ان کے جذبات اس موقع پر بھی ہوئے کہ اگر خود ان کے بطن سے کوئی اولاد ہوتی تو وہ پیغمبر کے بیٹے کہلاتے اور بجائے

اور حضرت ابوبکر کی نظروں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ مدینہ کو مہاجرین و انصار سے خالی کرنے کا مقصد بھی ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے بعد علی سے کوئی مزاحمت نہ کر سکے اور کسی شورش انگیزی کے بغیر آپ منصب خلافت پر فائز ہو سکیں چنانچہ حبش اسامہ اس پیغام پر پلٹ آیا۔ جب پیغمبر نے یہ دیکھا تو اسامہ کو پھر لشکر لے جانے کی تاکید فرمائی اور یہ تک فرما دیا کہ جو شخص لشکر اسامہ سے تخلف کرے گا اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ لشکر روانہ ہوا مگر پھر انھیں واپس بلا لیا جاتا ہے یہاں تک کہ پیغمبر پر نزع کا عالم طاری ہونے لگا لیکن لشکر کو روانہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اس کارروائی کے بعد بلال کے ذریعہ حضرت ابوبکر کو یہ کہلوایا جاتا ہے کہ وہ نمازیں امامت کے فرائض انجام دیں تاکہ ان کی خلافت کا راستہ ہموار ہو جائے۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر انھیں خلیفۃ الرسول علی الصلوٰۃ کہہ کر خلیفہ علی الاطلاق مان لیا گیا اور پھر ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ کسی طرح خلافت امیر المومنین تک نہ پہنچ سکے لیکن دور عثمانیہ کے بعد حالات نے اس طرح کروٹ لی کہ لوگ حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت عائشہ اس موقع پر مکہ میں تشریف فرما تھیں۔ انھیں جب امیر المومنین کی بیعت کا علم ہوا تو ان کی آنکھوں سے شرارے برسنے لگے۔ غیظ و غضب نے نسوانی مزاج میں برہمی پیدا کر دی اور دیرینہ نفرت نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ جس خون کے بہانے کا فتویٰ دے چکی تھیں اسی کے قصاص کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور کھلم کھلا اعلان جنگ کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں ایسا کشت و خون ہوا کہ بصرہ کی سرزمین سرخ ہو گئی اور اتر اقصیٰ انگیزی کا دورہ ہمیشہ کے لیے کھل گیا۔

مولانا ندوی نے اپنی کتاب 'المرفعی' میں ابوبکر کے نماز پڑھانے کا واقعہ بڑی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں حضرت ابوبکر کو انتہائی

جب جناب سیدہ سے اس حد تک دشمنی تھی تو جن سے آپ کا دامن دہشتہ تھا وہ حضرت عائشہ کی دشمنی اور عناد سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا جبکہ ایسے واقعات بھی رونما ہوتے رہے ہوں جو اس مخالفت کو ہوا دیتے اور جذبہ نفرت کو ابھارتے رہے ہوں۔ جیسے واقعہ انک کے سلسلے میں حضرت علیؑ کا پیغمبر سے یہ کہنا کہ "یہ تو آپ کی جوتی کا تسمہ ہے" اسے چھوڑیے اور طلاق دے کر الگ کیجیے۔

جب حضرت عائشہ نے یہ سنا ہوگا تو یقیناً بے قراری کے بستر پر کہ و میں بدلنے لگی ہوں گی اور حضرت علیؑ کے خلاف جذبہ شدت نفرت کے ساتھ آپ کے دل میں ابھرا ہوگا۔ پھر ایسے واقعات بھی پیش آتے رہے کہ ان کے باپ حضرت ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کو امتیاز دیا گیا اور ان کے مدارج کو بلند و نمایاں کر کے دکھایا گیا، جیسے کہ تبلیغ سورہ براءت کے سلسلے میں پیغمبر کا انھیں معزول کر کے واپس بلالینا اور یہ خدمت علیؑ کے سپرد کرنا۔ مسجد نبوی میں کھلنے والے تمام دروازے جن میں حضرت ابوبکر کا بھی دروازہ تھا، جزو دینا اور صرف حضرت علیؑ کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دینا وغیرہ، یہ وہ باتیں تھیں جن کے سبب سے حضرت علیؑ کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عائشہ کا اہل بیت سے جذبہ نفرت بام عروج پر تھا۔

اس کے علاوہ بھی حضرت عائشہ اپنے باپ کے مقابلے میں حضرت علیؑ کا تفوق گوارا نہ کر سکتی تھیں اور جب بھی کوئی امتیازی صورت پیدا ہوتی تو اسے مٹانے کی کوئی کوشش اٹھانہ رکھتی تھیں۔ چنانچہ جب پیغمبر نے آخر وقت حضرت اسامہ کے ہمراہ لشکر روانہ کیا اور حضرت ابوبکر اور عمر کو بھی ان کے زیر امارت جانے کا حکم دیا تو ازواج پیغمبر کے ذریعہ انھیں یہ پیغام ملتا ہے کہ پیغمبر کی حالت نازک ہے، لشکر کو آگے بڑھنے کے بجائے پلٹ آنا چاہیے۔ کیونکہ حضرت عائشہ

فضیلت کا حامل قرار دیا ہے۔ اول تو نماز پڑھانے کا یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ آپ کی بیٹی حضرت عائشہ کا تھا جس کے ذریعہ وہ اپنے باپ کی خلافت کا راستہ ہموار کر رہی تھیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ علمائے اہل سنت کے نزدیک اسلام میں امامت نماز کی کچھ اہمیت اور فضیلت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ”ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے خواہ وہ نیک ہو یا فاسق و فاجر ہو یا گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ کرتا ہو“ (دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح باب الامت) جب فاضل مولف کے علماء کے نزدیک ایک فاسق و فاجر اور گناہ کبیرہ کے مرتکب انسان کے پیچھے نماز پڑھی جاسکتی ہے تو پھر حضرت ابو بکر کو فضیلت دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ حضرت ابو بکر کا یہ سازشی عمل اس قابل ہے کہ اس کو موضوع بحث قرار دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کے باب میں جو وضاحت پیش کی گئی وہ اہم اور ضروری تھی۔ اب ہم پھر رہوار قلم کو موضوع شہادت کی طرف موڑتے ہیں تاکہ گفتگو ناتمام نہ رہے۔

۸ ہر صفر ۱۱؎ کا دن عالم اسلام میں قیامت کی طرح نمودار ہوا جب اللہ کے آخری رسولؐ نے زہر سے لبریز جام شہادت نوش فرما کر اپنے معبود کو لبیک کہا ملک الموت نے آپ کے خلعت ظاہرہ کو اتار کر حلقہ بہشت پہنایا۔ بزم انبیاء اور صف ملائکہ سے انا اللہ وانا الیہ راجعون کا شور بلند ہوا۔ دین اسلام نے فرش غم بچھایا اور شریعت مصروف ماتم ہو گئی۔

ایک طرف اہل بیت اطہار میں کبرام تھا تو دوسری طرف کچھ سفاک چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ اس غم و اندوہ کے ماحول اور کرب و اضطراب کے عالم میں فطرت انسانی کا تقاضا تو یہ تھا کہ رسول کی عقیدت و محبت کا دم بھرنے والے اور

بزم ادب آموز میں بیٹھنے والے آل رسولؐ کے غمزدہ دلوں کے زخموں پر تسلی کا مرتبہ رکھتے اور انھیں ہر طرح کا دلاسہ دیتے۔ لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ نہ ہو سکا بلکہ حصول اقتدار کا ایک سوچا سمجھا ہوا دیرینہ منصوبہ انسانیت کی راہ میں حائل ہو گیا اور جس نے صحابیت کے تمام فرائض پر پانی پھیر کر صحابہ کو کسی قابل نہ رکھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی سب سے پہلے شخص حضرت عمرؓ تھے جو برہنہ تلوار لیے ہوئے مصلحت کے اسٹیج پر کسی فلمی اداکار کی طرح نمودار ہوئے اور اپنی گدھدارو بے ہنگم آواز میں بولے کہ خبردار اگر رسولؐ کے بارے میں کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو خدا کی قسم میں اس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالوں گا اور اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اس ہنگامہ آرائی اور اداکاری کا مقصد دراصل اپنے منصوبہ کے تحت رسولؐ کی خبر شہادت کو روکنا اور مسلمانوں میں دہشت پھیلانا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سسرے حضرت ابو بکرؓ نہ جانے کس مصلحت کے پیش نظر مدینہ سے ملحق ایک گاؤں رخ میں اپنے خسر خارجہ بن زید انصاری کے یہاں قیام پذیر تھے اور اپنی نئی نوپلی دولہن سے داد خواہی میں مصروف تھے جبکہ اصولاً آپ کو دوران علالت اپنے داماد کے پاس موجود رہنا چاہیے تھا۔

چنانچہ اپنی اداکاری کے دوران حضرت عمرؓ نے سالم بن عبیدہ کو آپ کے پاس دوڑایا کہ رسول اللہؐ دنیا سے رخصت ہو چکے اب آپ فوراً آئیے ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

حضرت ابو بکرؓ گویا منتظر تھے۔ فوراً آئے اور آتے ہی آپ نے حضرت عمرؓ کے کان میں نہ جانے کون سا منتر پھونک دیا کہ آن واحد میں آپ کا سارا بھوت اتر گیا اور اداکاری ہوا ہو گئی۔

اس کے بعد یہ دونوں صاحبان ابو عبیدہ کے ہمراہ رسول اللہؐ کی میت کو

”سادہ لوح مسلمان اور چالاک منافقین مرے نہیں تھے بلکہ منافقین کی نقاب چہروں پر ڈالے مسلمانوں میں مل گئے تھے اور اس دن کا انتظار کر رہے تھے کہ پیغمبر کی آنکھیں بند ہوں اور وہ سلطنت اسلامی پر قبضہ کر کے خوب گلچڑھے اڑائیں۔ منافقین کے نقطہ نظر سے وفات رسول کا وقت ہی اس کے لیے نہایت مناسب و مسعود تھا کہ وہ بھولے بھالے مسلمانوں کی مدد سے اپنی دیرینہ آرزوئیں بروئے کار لائیں اور ۲۳ سال تک جس بات کو دل کی گہرائیوں اور منافقت کے پردوں میں چھپائے ہوئے تھے اسے ظاہر کر کے رہیں۔ رسول کے انتقال کے بعد ہی جب کہ ابھی حضور اکرم کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی، جنازہ کو چھوڑ کر صحابہ کا یہ اقتدار پسند گروہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گیا اور بالآخر حضرت ابوبکر خلیفہ بن گئے۔“

مولانا خواجہ حسن نظامی ماہنامہ ”منادی“ جلد ۳۴ شمارہ ۱۱ میں الکشن اور سقیفہ کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

”یہ ڈبونے والی آگ اور جلانے والا پانی ہے، اس میں سر نہیں، دل نہیں، دماغ نہیں۔ اس کی ناک میں سو سوراخ اس کے چہرے پر ہزار ہزار آنکھیں ہیں۔ اس کی غذا جھوٹ ہے، مکہ ہے، فریب ہے۔ اس کی شکل بلی سے زیادہ مسکین، مگر پیچہ شیر سے زیادہ خاردار ہے۔ اگر سقیفہ کے دن وہ گھر سے باہر نہ نکلا تو کیا ڈر ہے وہ الکشن کی حکمتوں سے تہی دست تو نہ تھا۔ وہ کون؟ میرا باپ، میرا دادا اور رسول خدا کے بعد سب سے بڑا آدمی علی مرتضیٰ علیہ السلام“

تاریخ احمدی ص ۱۰۸ میں بحوالہ کنز العمال عروہ سے روایت ہے کہ پیغمبر کے دفن کے وقت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر موجود نہ تھے بلکہ سقیفہ میں تھے۔ قبل اس

بے غسل و کفن چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ روانہ ہو گئے جہاں پیغمبر اسلام کی خلافت و نیابت کا تاج حضرت ابوبکر کو پہنانا مقصود تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ:

”وآحضرت کے انتقال کے فوراً بعد خلافت کی نزاع پیدا ہو گئی اور

اس بات کا بھی انتظار نہ کیا گیا کہ پہلے رسول اللہ کی تجہیز و تکفین سے فراغت

حاصل کر لی جائے۔ کس کے قیاس میں آسکتا ہے کہ رسول اللہ انتقال فرمائیں

اور جن لوگوں کو ان کے عشق و محبت کا دعویٰ ہو وہ ان کو بے گور و کفن چھوڑ کر

چلے جائیں اور اس بند و بست میں مصروف ہوں کہ منہ حکومت اوروں

کے قبضہ میں نہ آجائے۔ تعجب پر تعجب یہ ہے کہ یہ فعل ان لوگوں (حضرت

ابوبکر اور حضرت عمر) سے سرزد ہو، جو آسمان کے جہر و ماہ تسلیم کے جاتے

ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ تجہیز و تکفین چھوڑ کر

سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے سقیفہ میں پہنچ کر

خلافت کے باب میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور اس طرح ان کو ششوں

میں مصروف رہے گویا ان پر کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے

کہ انھوں نے اپنی خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علی سے

بزرگتر شمشیر منوانا چاہا۔“ (الفاروق مطبوعہ مفید عام اگر ۱۹۰۸ء حصہ اول ص ۶۶-۶۷)

شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب اپنی کتاب اہمات الائمہ میں رقم طراز ہیں:

”جن بھگڑوں، محتاجوں اور فاقہ مست لوگوں نے فاطمہ کے باپ کی بدولت

عروج پایا اور خاک مذلت سے اوج عزت پر پہنچے، ان کو شایان شان نہ

تھا کہ فاطمہ کے باپ کی رعایت اور پرورش کے حقوق کو کبیر بھلا دیتے“

ڈاکٹر محمد ابوبکر خاں صاحب طبع آبادی ”اسلام اور بنی امیہ“ کے عنوان سے محرم

۱۳۸۵ھ میں شائع شدہ اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں کہ:

کہ یہ دونوں صاحبان وہاں سے واپس آئیں، رسول اللہ ﷺ دفن ہو چکے تھے۔

تاریخ ابن خلدون میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ میرے باپ ابو بکر اور عمر بن خطاب رسول اللہ کی میت کو چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے تھے لیکن علیؑ ابن ابی طالب، عباس اور عباس کے دونوں پسران، فضل اور قثم اور اسامہ بن زید رسول اللہ کی تجہیز و تکفین میں مشغول رہے۔ علیؑ نے آنحضرت کو غسل دیا، غسل اور ان کے دونوں پسران آنحضرت کے جسم اطہر کو پلٹتے جاتے تھے اور اسامہ پانی ڈال رہے تھے۔ (تاریخ ابن خلدون ص ۶۳ مطبوعہ ۱۲۸۳ھ)

الغرض جب حضرت ابو بکر خلیفہ بن کر اور حضرت عمر خلیفہ بنا کر سقیفہ بنی ساعدہ سے واپس ہوئے تو دین و دنیا کے تاجدار سپرد خاک ہو چکے تھے۔
اقتدار کی خاطر شیخین نے وہ حالات پیدا کر دیے تھے کہ سرور کائنات اور دین و دنیا کے تاجدار کی میت میں آل اطہار کے علاوہ صرف پانچ آدمی شریک ہو سکے جبکہ مسلمانوں کے مجمع سے مدینہ کی گلیوں کو جھلک جانا چاہیے تھا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت

سقیفہ بنی ساعدہ مدینہ منورہ سے تین میل کی دوری پر ایک چھتے کا نام ہے، جہاں چور، بد معاش اور لٹیرے جمع ہو کر لوٹ مار کا منصوبہ تیار کرتے تھے اور لوٹے ہوئے مال کا بٹوارہ کیا کرتے تھے۔ اجماع کے بعد اس مقام کی تاریخی حیثیت اس لیے اور مستحکم ہو گئی کہ یہاں حضرت علیؑ کے حقوق خلافت پر ڈاکڑا ل کر لٹروں نے اسے لوٹ لیا۔

سقیفہ کی کارروائی

سقیفہ کی کارروائی اسلام میں تخریب کاری کی وہ منزل ہے جہاں تمام

ارشادات پیغمبری، احکام الہی اور اسلامی اصولوں کو فراموش کر کے، جھوٹ، فریب اور مکر کی بنیاد پر ایک غیر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا اور اسی غیر اصولی کارروائی کے ذریعہ حضرت ابو بکر ملت مسلمہ کے خود ساختہ خلیفہ بن بیٹھے۔
شیخ محمد مہدی علیہ الرحمہ کی کتاب ”جہاد حسین“ کے مترجم شیخ محسن علی نجفی تحریر فرماتے ہیں:

”اگر ہم سقیفہ میں اپنائی گئی گفتگو میں منطق کا جائزہ لیں تو قبائلی تعصبات نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں چنانچہ ابو بکر کے قلم سے ”اوس“ اور ”خزرج“ کے درمیان عداوت کا احیا ہو گیا۔ انھوں نے دونوں قبیلوں کے مقتولین کا ذکر کیا اور ان زخموں کا ذکر کیا جو ابھی تک مندر نہ ہوئے تھے۔ دوسری طرف سے حباب ابن منذر نے بھی اسی جاہلانہ جذبہ سے بات کی اور انصار کو مشتعل کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔

مہاجرین کی سوچ بھی اس سے مختلف نہ تھی، ان کا کہنا تھا کہ محمد صلعم کے اقتدار میں ہمارا مد مقابل کون ہو سکتا ہے جبکہ ہم ان کے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالات اسی ڈگر پر چل نکلے جس کے خطوط حضرت ابو بکر نے قائم کیے تھے۔ چنانچہ انصار قبائلی تعصب سے متاثر ہو کر بٹ گئے اور خلافت کے لیے ان کے امیدوار سعد ابن عبادہ خزرجی اس وقت گوشہ نشین ہو گئے جب قبیلہ ”اوس“ نے ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔“

پیغمبر کی تجہیز و تکفین کے بعد جب امیر المومنین نے سقیفہ کی کارروائی کا حال سنا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ انصار کیا کہتے تھے؟ تو لوگوں نے کہا کہ وہ کہتے تھے کہ ایک ہم میں سے امیر ہو اور ایک تم میں سے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے

یہ دلیل کیوں نہ پیش کی رسول اللہ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ انصار میں جو اچھا ہو اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور جو برا ہو اسے درگزر کیا جائے لوگوں نے کہا کہ اس میں ان کے لیے خلافت کا کیا ثبوت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر حکومت و امارت ان کے لیے ہوتی تو ان کے مقابلہ میں دوسروں کو وصیت کیوں کی جاتی پھر حضرت نے پوچھا کہ قریش نے کیا کہا۔ لوگوں نے کہا کہ انھوں نے شجرہ رسولؐ سے ایک ہونے کی بنا پر اپنے استحقاق پر استدلال کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ شجرہ ایک ہونے پر تو استدلال کیا لیکن اس کے پھلوں کو ضائع و برباد کر دیا۔

(جہاد حسین ص ۱۱-۱۳ بحوالہ بیچ البلاغہ ص ۲۰۹-۲۱۰)

امیر المومنین علیہ السلام کی اس حکیمانہ گفتگو کی تشریح میں مفسر بیچ البلاغہ علامہ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ فرماتے ہیں:-

سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انصار کے مقابلہ میں ہاجرین کی سب سے بڑی دلیل اور وجہ کامرانی یہی چیز تھی کہ قریش چونکہ پیغمبر کے ہم قوم و ہم قبیلہ ہیں لہذا ان کے ہوتے ہوئے کوئی غیر خلافت کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر انصار کا جم غفیر صرف تین ہاجرین کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا اور وہ نسلی امتیاز کی بنا پر بازی جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ مورخ طبری واقعات سقیفہ کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں سعد ابن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کا اجماع کیا تو حضرت ابو بکر حضرت عمر اور ابو عبیدہ بن جراح بھی سن گئے پاکر وہاں پہنچ گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر نے پہلے ہی سے کچھ سوچ لیا تھا جسے کہنے کے لیے وہ کھڑے ہوئے گو ابو بکر نے انھیں روک دیا اور خود کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ:

یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے زمین پر اللہ کی پرستش کی اور

ایمان لائے۔ یہی پیغمبر کے دوست اور ان کے کنبہ والے ہیں اور یہی سب سے زیادہ خلافت کے حق دار ہیں۔ جو ان سے ٹکرائے گا وہ ظالم ہوگا۔

(طبری ج ۲ ص ۲۵۷)

جب ابو بکر اپنا بیان ختم کر چکے تو جناب ابن منذر کھڑے ہوئے اور انھوں نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا۔ اے گروہ انصار! تم اپنی باگ ڈور دوسروں کے ہاتھ میں نہ دو، دنیا تمھارے سائے میں بس رہی ہے۔ تم عزت و ثروت والے اور قبیلے و جتنے والے ہو۔ اگر ہاجرین کو تم پر بعض چیزوں میں فضیلت حاصل ہے تو تمھیں بھی بعض چیزوں پر فوقیت حاصل ہے۔ تم نے انھیں اپنے گھروں میں پناہ دی۔ تم ہی اسلام کے بازوئے شمشیر زن ہو۔ تمھاری ہی وجہ سے اسلام اپنے پیروں پر کھڑا ہوا ہے۔ تمھارے شہروں میں آزادی سے نمازیں قائم ہوئیں۔ تم تفرقہ اور انتشار سے اپنے کو بچاؤ اور اپنے حق پر پہنچتی سے جمے رہو۔ اگر ہاجرین تمھارا حق تسلیم نہ کریں تو پھر ان سے کہو کہ ایک امیر تم میں سے ہوگا اور ایک امیر ہم میں سے ہوگا۔

جناب یہ کہہ کر بیٹھے ہی تھے کہ حضرت عمر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں دو حکم ال ہوں۔ خدا کی قسم عرب اس بات پر کبھی راضی نہ ہوں گے کہ تمھیں اپنا امیر بنائیں جب کہ نبیؐ تم میں سے نہیں تھے، البتہ عربوں کو اس امر میں پس و پیش نہ ہوگا کہ وہ خلافت کو اس کے حوالے کر دیں کہ جس کے گھرانے میں نبوت ہو اور صاحب امر بھی انھیں میں سے ہو اور انکار کرنے والے کے سامنے اس سے ہمارے حق میں کھلم کھلا دلیل اور واضح برہان لائی جا سکتی ہے۔ جو ہم سے محمد کی سلطنت و امارت میں ٹکرائے گا وہ باطل کی طرف جھکنے والا ہوگا۔ (طبری ج ۲ ص ۲۵۷)

حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کا مکمل تہیہ کر لیا۔ ابھی وہ ان کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ بشیر نے سب سے پہلے اپنا ہاتھ ابو بکر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر اور ابو عبیدہ نے بیعت کی اور سعد ابن عبادہ کو پیروں تلے کچل کر رکھ دیا۔

امیر المومنین علیہ السلام اس موقع پر پیغمبر کے غسل و کفن میں مصروف تھے۔ بعد میں جب سقیفہ کی کارگزاری سنی تو یہ لطیف جملہ ارشاد فرمایا کہ شجرہ ایک ہونے کی دلیل تو لائے ہیں لیکن اس کے پھلوں کو ضائع کر دیا جو پیغمبر کے اہل بیت ہیں۔

خلیفہ کی ضرورت اور تقرری

خلاق کائنات نے جب خلیفہ کی ضرورت کو محسوس کیا تو ملائکہ سے فرمایا کہ میں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بھیجنے والا ہوں۔ چنانچہ اسی ارادہ قدرت کے تحت حضرت آدم کی تخلیق عمل میں آئی، اور پھر آدم سے لے کر خاتم الانبیاء تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ہر نبی اپنے بعد اپنا نائب و جانشین مقرر کرتا رہا۔ غرض کہ حضرت آدم نے اپنے بیٹے شیث کو اپنا ولی عہد اور جانشین بنایا۔ حضرت شیث نے انوش کو اور انوش نے اپنے فرزند قیتان کو اپنا وصی بنایا۔ قیتان نے ہانیل کو جانشین مقرر کیا، ہانیل نے یزدیار کو اور یزدیار نے اپنے فرزند خوخ (حضرت ادریس) کو اپنی جانشینی کا شرف بخشا۔ حضرت ادریس کے بعد ان کے بیٹے متوشلخ ان کے جانشین ہوئے اور متوشلخ نے ملک کو اپنا خلیفہ بنایا۔ پھر حضرت نوح نے اپنے فرزند سام کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کو شام میں اپنا نائب اور وزیر مقرر فرمایا اور جب حضرت اسمٰعیل کا زمانہ وفات

حضرت عمر کے اس بیان کے بعد حباب پھر کھڑے ہوئے اور انصار کو مخاطب کر کے کہا کہ دیکھو اپنی بات پر ڈٹے رہو اور اس کی اور اس کے ساتھی کی باتوں میں نہ آؤ۔ یہ شخص تمہارے حقوق کو دبا نا چاہتا ہے۔ اگر ہاجرین نہیں مانتے تو انھیں اپنے شہروں سے نکال دو اور خلافت کو سنبھال لو۔ بھلا تم سے زیادہ اس کا حق دار کون ہو سکتا ہے۔

جب حباب خاموش ہوئے تو حضرت عمر نے انھیں سخت و سخت کہا اُدھر سے بھی تلخ کلامی ہوئی اور رنگ بگڑنے لگا۔ ابو عبیدہ نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ نازک ہے تو انصار کو ٹھنڈا کرنے اور اپنے ڈھرے پر لانے کے لیے بولے۔ اے گروہ انصار! تم وہی ہو جنہوں نے ہمیں سہارا دیا، ہماری امداد کی، اور اب اپنی روش کو نہ بدلو اور اپنے طور و طریقوں کو نہ چھوڑو۔ مگر انصار ان کی خوشامد میں نہیں آئے کیونکہ وہ سعد کے علاوہ اور کسی کی بیعت پر تیار نہ تھے اور وہ بیعت کے لیے بڑھا ہی چاہتے تھے کہ سعد ہی کے قبیلے کا ایک شخص بشیر خنجر جی اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

بے شک ہم نے جہاد میں قدم بڑھایا اور دین کو سہارا دیا مگر اس سے ہماری غرض صرف اللہ کی رضا مندی اور اس کے رسول کی اطاعت تھی ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم تفوق جتلائیں اور خلافت کے معاملہ میں جھگڑا کریں چونکہ محمد قریش سے تھے لہذا ان کی وراثت اور نیابت کا حق بھی انھیں کی قوم کو پہنچتا ہے۔

بشیر کا یہ کہنا تھا کہ انصار میں بھوٹ پڑ گئی اور بشیر کا مقصد بھی یہی تھا، کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے کسی شخص کو اس طرح بڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔

ہاجرین نے اس افتراق سے پورا فائدہ اٹھایا اور حضرت عمر اور ابو عبیدہ

”اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدام کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔“ (سورۃ المائدہ - ۶۷)

(المترقی ص ۱۲۱ - ۱۲۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا ندوی کے اس بیان پر ”ماؤ گھٹنا بھولے ٹانگے“ والی کہادت مکمل طور پر حاوی ہے۔ اس لیے کہ مولانا نے اپنی غلط اور تہل بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے قرآن مجید کی جس آیت کا سہارا لیا ہے اس کا نزول پیغمبر اسلام پر آخری حج کی واپسی کے دوران ہوا اور پیغمبر نے اس حکم الہی پر عمل پیرا ہو کر میدان غدیر میں پالان شتر کے منبر سے علیؑ کی ولایت اور جانشینی کا اعلان کر کے اللہ کے اس پیغام کو مسلمانوں تک پہنچا دیا جس کے لیے حکم تھا۔ مکمل وضاحت باب ثانی میں بخیر کے۔ عنوان سے پیش کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ جہاں تک پیغمبر کا اپنے بعد اپنا جانشین مقرر یا نہ مقرر کرنے کا سوال ہے اس موضوع پر مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ نے بڑی مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

”پیغمبر اسلام کے بعد ایک ایسی ہستی کا وجود ناگزیر تھا جو امت کا شیرازہ نہ بکھرنے دے اور شریعت ان لوگوں کے دست برد سے بچائے رکھے جو اسے توڑ مروڑ کر اپنی خواہشوں کے مطابق ڈھال لینا چاہتے ہوں۔ اگر اس کی ضرورت سے انکار کر دیا جائے تو پھر پیغمبر کے بعد ان کی نیابت و جانشینی کے مسئلے کو اتنی اہمیت دینے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ ان کی تجہیز و تکفین پر سقیفہ بنی ساعدہ کے اجماع کو مقدم سمجھ لیا جائے اور اگر اس کی ضرورت ثابت ہے تو کیا پیغمبر کو بھی اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس تھا اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے کہ انھیں اس کی ضرورت یا عدم ضرورت کا احساس

قریب آیا تو انھوں نے بھی اپنے بھائی اسماعیلؑ ہی کو اپنی ذمہ داری سونپی۔ حضرت اسماعیلؑ نے ایک دوسرے مقام پر قیدار کو بھی اپنا وصی بنایا تھا۔ حضرت اسماعیلؑ نے اپنے فرزند یعقوبؑ کو اپنا ولی عہد مقرر فرمایا۔ حضرت موسیٰؑ نے ہارونؑ کو اپنا ولی بنایا تھا لیکن ہارونؑ کا انتقال چونکہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اس لیے ہارونؑ کے بعد یوشع بن نونؑ حضرت موسیٰؑ کے وصی مقرر ہوئے۔ یوشع بن نونؑ نے کالب کو اور کالب نے اپنے فرزند یوسافوس کو اپنا وصی مقرر کیا۔ جناب داؤدؑ نے اپنے فرزند سلیمانؑ کو اپنا وصی مقرر کیا اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنا وصی شمعون کو مقرر کیا۔ (روضۃ الصفا ج ۱ ص ۱۸۴، تاریخ طبری ج ۱ ص ۷۶، ۸۲، ۸۳، ۱۷۲، ۱۷۷، ۲۸۵، تاریخ کامل ج ۱ ص ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۸۲ وغیرہ)

انبیاء و مرسلین میں نیابت، وصایت، ولایت اور خلافت کا یہ سلسلہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ خدا نے ہر نبی کو اپنے بعد اپنی امت کے لیے جانشین اور قائم مقام مقرر کرنے کا اختیار دیا ہے۔ لہذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ جو تاجدار انبیاء اور فخر مرسلین ہو وہ اپنی امت کو مفسدین اور منافقین کے رحم و کرم پر لاوارث چھوڑ جائے۔ لیکن ”المترقی“ کے فاضل مولف مولانا ندوی کا اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر یہ کہنا تعجب خیز ہے کہ ”اسلام نے خلیفہ کے منتخب کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں اور اہل شوریٰ اور اہل علم و اخلاص کے سپرد کر دی۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہوگا۔ اگر ایسا کرنا دینی فرائض میں داخل ہوتا اور اس کو صراحت کے ساتھ بتا دینا ضروری ہوتا تو آپ اس حکم کی تنقید ضرور فرماتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:-

مذہبیان نے جب یہ دیکھا کہ راویوں کا متفق ہونا مشکل ہے تو اقلیت کے اختلاف کو نظر انداز کر کے اکثریت کے اتفاق کو اجماع کے قائم مقام ٹھہرایا۔ لیکن اس صورت میں بھی اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ حق و ناحق اور جائز و ناجائز وسائل کا کا زور اکثریت کا رخ ادھر موڑ دیتا ہے جہاں نہ شخصی فضیلت ہوتی ہے نہ ذاتی قابلیت جس کے نتیجے میں اہل افراد دیکے پڑے رہ جاتے ہیں اور نا اہل ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ تو جہاں صلاحیتیں پھیل پھیل کر رہ جاتیں اور ذاتی غرضیں روک بن کر کھڑی ہو جاتیں وہاں کسی صحیح شخص کے انتخاب کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تمام رائے دہندگان ایسے افراد ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی رائے آزاد اور بے لاگ ہے، نہ ان میں کوئی صاحب غرض ہے نہ کسی کی رورعایت رکھنا ہے تو بھی کہاں یہ ضروری ہے کہ اکثریت کا فیصلہ صحیح ہو اور وہ بھٹک کر غلط راستے پر آ ہی نہ سکے جبکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اکثریت نے تجربہ کے بعد خود اپنے فیصلوں کو غلط بھی ٹھہرایا ہے۔

ان حالات میں اگر خلیفہ وجانشین کا انتخاب غلط ہو تو اس غلطی کے ہلکے نتائج کا ذمہ دار کون ہوگا اور اسلام کی ہیئت اجتماعی کی تباہی و بربادی کا مظہر کس کی گردن پر جائے گا اور پھر انتخاب کی ہنگامہ آرائیوں اور شورش انگیزیوں پر جو خون ریزی اور فساد برپا ہوگا وہ کس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا جبکہ بزم ادب آموز میں بھی بیٹھنے والوں کو دیکھا جا چکا ہے کہ وہ باہم آویزیوں سے نہ بچ سکے تو کسی اور کا دامن کیا بچ سکتا ہے۔

اگر ان مفاسد سے بچنے کے لیے اسے اہل حل و عقد پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی صواب دید سے کسی ایک کو منتخب کر لیں تو یہاں بھی وہی انتشار و گمبختش کی صورت پیش آئے گی کیونکہ انسانی طبائع کا یہاں بھی ہم آہنگ ہونا ضروری

ہوتا تو پیغمبر کے ذہن کو ارتداد کی فتنہ انگیزیوں اور بدعتوں کی کار فرمائیوں کی خبر دینے کے باوجود ان کی روک تھام اور فکر کی تدبیر سے خالی سمجھ لینا عقل اور بصیرت سے محرومی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ احساس تو تھا مگر مصلحت کی بنا پر اسے غیر طے شدہ چھوڑ جانے پر مجبور تھے تو اس صورت میں اس مصلحت کو زیر نقاب رہنے کے بجائے کھل کر سامنے آنا چاہیے ورنہ بے وجہ خاموشی فرائض نبوت میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔ اور اگر کوئی مانع تھا تو اس مانع کو پیش کرنا چاہیے، ورنہ اسے تسلیم کیجیے کہ جس طرح آپ نے ذہن کا کوئی گوشہ ادھورا نہیں چھوڑا اسی طرح اسے بھی نا تمام نہیں رہنے دیا اور ایک ایسا لائحہ عمل تجویز فرمایا کہ جس کے بروئے کار لانے سے دین دوسروں کے دست برد اور استیلا سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ طریقہ کار کیا تھا؟ اگر اجماع امت کو پیش کیا جائے تو اس کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اجماع میں ایک ایک فرد کا اتفاق رائے ضروری ہے اور اگر انسانی طبائع کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک نقطہ پر متحد ہو جائیں اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ جہاں ایسے موارد پر اختلاف کی کوئی آواز نہ اٹھی ہو، تو پھر کیونکہ ایک ایسی بنیادی ضرورت کو ایک ناممکن الوقوع امر سے وابستہ کیا جاسکتا ہے کہ جس پر اسلام کے مستقبل کا انحصار ہو اور مسلمانوں کے فلاح و بہبود کا دار و مدار ہو۔ لہذا نہ عقل اس معیار کو تسلیم کرنے کو تیار ہے نہ نقل ہی اس سے ہمنوا ہے۔ چنانچہ قاضی عسک الدین نے موافق میں تحریر فرمایا ہے کہ:

”تمہیں جانتا چاہیے کہ خلافت کا انعقاد اجماع پر منحصر ہے، کیونکہ اس پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل قائم نہیں ہو سکتی“

انتخاب کو نظر انداز کر دیا۔

حضرت عائشہ کے نزدیک بھی خلافت کو امت یا چند مخصوص افراد کی رائے پر چھوڑنا فتنہ و فساد کو دعوت دینا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عمر کو بستر مرگ پر پیغام بھجوایا کہ امت محمدیہ کو بغیر کسی پاسبان کے نہ چھوڑے اور اسے بے مہار رہنے نہ دیکھے کیونکہ اس صورت میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے۔ جب اہل حل و عقد کا طریقہ بھی کامیاب نہ ہوا تو اسے بھی ختم کر دیا گیا اور یہ کہ ”ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند“ معیار بن کر رہ گیا۔ یعنی جو دوسروں کو اپنے اقتدار اور تسلط کے بندھن میں جکڑ لے وہی خلیفہ برحق و جانشین رسولؐ ہے۔

یہ تھے وہ خود ساختہ اصول جن کے سامنے پیغمبرؐ کے تمام ارشادات جو انھوں نے دعوت ذوالعشرہ، شب ہجرت، غزوہ تبوک، تبلیغ سورہ برات اور غدير خم کے موقع پر فرمائے تھے، یکسر فراموش کر دیے گئے۔

ہجرت ہے کہ جب تینوں خلافتیں ایک ہی فرد کی رائے سے طے پاتی ہیں تو پھر کس دلیل کی بنا پر پیغمبرؐ سے یہ حق سلب کیا جاتا ہے کہ وہ کسی کا تعین خود فرما دیتے اور تمام خلفشار سے امت کو محفوظ کر جاتے۔ چنانچہ پیغمبرؐ نے وقت آخر فرمایا کہ مجھے قلم دوات اور کاغذ دے دو تا کہ یہ نوشتہ چھوڑ دوں کہ میرے بعد کون خلافت کا حق دار ہوگا لیکن آنحضرتؐ کی اس خواہش نوشتہ کو حضرت عمرؓ نے ٹھکرا دیا اور سقیفہ میں دوسرے تمام مسلمانوں سے ہٹ کر خلافت پر اجماع کیا اور پیغمبرؐ کی اس وصیت کو جو علیؓ کے بارے میں تھی بھول گئے۔۔۔۔

دھماچو کٹری

سقیفائی خلیفہ کی حیثیت سے جب حضرت ابو بکر تخت خلافت پر

نہیں ہے اور انھیں ذاتی اغراض کی سطح سے بلند قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ یہاں تصادم اور ٹکراؤ کے اسباب اور زیادہ قوی ہیں کیونکہ اکثر سبب نہیں تو اکثر خود اس منصب کے لیے امیدوار ہوں گے اور اپنی کامیابی کے لیے اپنے حریف کو زک پہنچانے میں کوئی تدبیر نہ اٹھا رکھیں گے اور جس طرح بن پڑے گا اس کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ باہم آویزی اور فتنہ انگیزی پیدا ہوگی اور جس اختلاف سے بچنے کے لیے یہ صورت پیدا کی گئی ہے اس سے بچاؤ نہ ہو سکے گا اور امت کسی صحیح فرد تک پہنچنے کے بجائے دوسروں کے ذاتی مفاد کا آلہ کار بن کر رہ جائے گی۔ پھر یہ اہل حل و عقد کا معیار کیا ہوگا؟ وہی جو ہر زمانے میں رہا ہے جس نے چند ہوا خواہ جمع کر لیے اور کسی اجتماع میں چند مخصوص و پرجوش لفظیں دہرا کر ہڑتال مچوا دی وہ ابھر کر اہل حل و عقد کی صف میں آگیا۔ یا صلاحیتوں کو بھی پرکھا جائے گا۔ اگر صلاحیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کا طریقہ یہی رائے عامہ ہے تو پھر وہی کش مکش اور الجھنیں یہاں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ جس کے لیے یہ راہ نکالی گئی ہے اور اگر کوئی معیار ہے تو اس پر ان کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے بجائے اس کی صلاحیت کو کیوں نہ پرکھ لیا جائے جسے اس منصب کا اہل سمجھا جا رہا ہے۔ یہ ہے سقیفہ بنی ساعدہ کی کارروائی اور شوریٰ کی گرم بازاری کہ ایک ہی شخص کے کارناموں کا نام اجماع اور ایک ہی فرد کی کار فرمائی کا نام شوریٰ رکھ دیا گیا۔

حضرت ابو بکرؓ نے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اجماع ایک ہی آدمہ کی رائے کا نام ہو کر تا ہے جسے بھولے بھالے عوام کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ اس لیے انھوں نے اجماع اور شوریٰ کا رنگ چڑھائے بغیر علانیہ حضرت عمرؓ کو نامزد کر کے اجماع کی پابندی، کثرت رائے کے معیار اور شوریٰ کے طریقہ

غاصبانہ قابض ہوئے اور اقتدار ہاتھ آیا تو آپ نے اپنے مافیا گروہ کے ذریعہ مدینہ کو مرکزِ آلام بنادیا اور ان لوگوں پر مظالم، تشدد اور غنڈہ گردی کا بازار گرم ہونے لگا جو آپ کی خلافت سے متفق نہیں تھے یا جن لوگوں نے آپ کی بیعت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس فہرست میں بنی ہاشم کے علاوہ سلمان فارسی، ابوذر غفاری، عمارؓ، یاسرؓ، مقدادؓ، خالد بن سعیدؓ، زبیرؓ، عقبہ بن ابولہبؓ، براء بن عازبؓ، ابی ابن کعبؓ، مالک بن نویرہؓ اور ابو سفیانؓ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان افراد نے ابوبکر کی ناجائز خلافت پر کھل کر احتجاج بھی کیا اور ان کے احتجاج کی آواز بازگشت صرف مدینہ کی گلیوں ہی تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے اثرات بیرون مدینہ یمامہ، منامہ، عمان، یمن، بحرین اور حضرموت وغیرہ پر بھی مرتب ہوئے اور شورش و بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانے کا جو راستہ اختیار کیا گیا وہ مظالم اور تشدد کا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ خالد بن ولید ایسے ظالم و جاہل شخص کو پندرہ ہزار کے لشکر کی سر داری دے کر یمامہ اور حضرموت وغیرہ کے مسلمانوں پر مسلط کر دیا۔ الغرض ایک طرف خالد بن ولید مدینہ سے باہر یمامہ اور حضرموت کے مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے تھے اور دوسری طرف اندرون مدینہ ابوبکر کی حمایت میں حضرت عمرؓ اپنی جماعت کو لیے بربریت کا ننگنا چ ناچ ناچ رہے تھے۔ جس کے سبب سے آل رسولؐ پر عرصہ حیات تنگ تھا۔ اہل بیت اطہارؑ سے حضرت عمرؓ کی دشمنی اور عداوت اس فعل سے ظاہر ہے کہ آپ امیر المومنین حضرت علیؑ علیہ السلام سے ابوبکر کے لیے بیعت طلبی کی گستاخی اور جبارت کو بیٹھے اور صرف یہی نہیں بلکہ چند غنڈوں کے ہمراہ آگ اور لکڑیاں لے کر رسولؐ کی عمر زدہ اور سوگوار

بیٹی فاطمہؑ زہراؑ کی جو کھٹ پر پہنچ گئے اور یہ مطالبہ کیا کہ علیؑ کو گھر سے باہر نکالو ورنہ ہم اس گھر میں آگ لگا دیں گے اور سب کو زندہ جلا کر خاک کر دیں گے۔ بنت رسولؐ جب اس ہنگامے سے باخبر ہوئیں تو آپ دروازے کے قریب تشریف لائیں اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا ہم سوگواروں کو گھر میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دو گے۔ عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اگر حضرت علیؑ ابوبکر کی بیعت نہ کریں گے تو ہم اس گھر کو کھونٹ کر دیں گے۔ جناب فاطمہؑ زہراؑ نے فرمایا کہ اس گھر میں ابواسمٰءؓ کے علاوہ رسولؐ کے دونوں نواسے حسنؓ اور حسینؓ بھی ہیں۔ عمرؓ نے کہا، ہو اگر ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اس جواب پر معصومہ کو نین بے اختیار رونے لگیں اور آپ نے فرمایا کہ اے پدر بزرگوار! آپ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ہم پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اور آپ کی امت کے لوگ ہم سے کس طرح بھڑکے ہیں۔ لیکن حضرت عمرؓ پر معصومہ کی اس آہ وزاری اور فریاد و فغاں کا مطلق اثر نہ ہوا، اور آپ نے وہی کیا جو آپ کا مقصد تھا۔ فاطمہؑ کے گھر میں آگ لگا دی گئی اور شعلے بلند ہونے لگے۔ لیکن اس پر بھی حضرت عمرؓ کے دل کو تسلی نہ ہوئی اور آپ کی آتش غضب ایسی بھڑکی کہ آپ نے جلتے ہوئے دروازے کو لات مار کر معصومہ پر گرا دیا جس کی ضرب سے آپ کا پہلو تے مبارک شکستہ ہو گیا اور آپ کے شکم میں جناب محسنؑ شہید ہو گئے۔ اس بے مثال کارنامے کے بعد حضرت عمرؓ درزانہ اپنے غنڈوں کے ہمراہ خانہ زہراؑ میں داخل ہوئے اور آپ نے دھما چوڑی مچا دی۔ سارے گھر کو تھس تھس کر ڈالا اور امیر المومنین حضرت علیؑ ابن طالبؑ جیسے شجاع و بہادر کے گلے میں اپنی بزدلی کی رسی باندھ کر گھر سے باہر لائے اور اسی حالت میں مولائے

مقتولین میں نشر حافظ قرآن بھی تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صدقات کے حامل تھے۔ حامیہ بن سبیح کو زندہ آگ میں جلا کر مار ڈالا گیا۔ مالک بن نویرہ کو خالد بن ولید نے قتل کر کے اس کا چولہا بنایا اور اس میں کھانا پکوا کر کھایا۔ جب اس پر انسانی خون کی آمیزش کا نشہ سوار ہوا تو اس نے اسی رات کو مالک کی سوگوار اور غم گسار بیوہ سے اپنا منہ کالا کیا۔ (تاریخ الاعیان ص ۲۷۹)

مالک بن نویرہ کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مالک کے سامنے حضرت ابو بکر نے اپنی بیعت کا سوال پیش کیا تو انھوں نے نہایت سختی اور حقارت سے بھڑک دیا اور کہا کہ آپ اپنی حیثیت پر قائم رہیے اور اپنے گھر بیٹھے اور اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کیجیے۔ آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ اس سخت خلافت پر قابض ہوئے ہیں جس کے لیے اللہ اور رسول نے کسی اور کو نامزد کر کے حاکم بنایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں حضرت علی کی ولایت اور خلافت کا اعلان کر کے کسی حجت اور دلیل کو باقی نہیں رکھا۔ (تحفۃ العباد ص ۴۰۵)

تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۳۱ میں ہے کہ جب خالد کے ہمراہی اس کی بربریت کو دیکھ کر چیخ اٹھے تو اس نے اپنے ساتھیوں کو ابو بکر کا تحریری حکم نامہ دکھایا۔

فدک پر قبضہ

انتہائی سخت گیر مظالم اور کرب و اضطراب کے عالم میں معصومہ کونین حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کو یہ اطلاع ملی کہ ابو بکر نے ایک فرضی حدیث کو رسول اللہ سے منسوب کر کے آپ کی جائیداد فدک پر قبضہ کر کے آپ کو ترکہ

کائنات کو لیے ہوئے دربار ابو بکر میں حاضر ہوئے اور کہا کہ بیعت کرو ورنہ خدا کی قسم سر کاٹ لوں گا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ تم لوگ کس حق کی بنیاد پر مجھ سے بیعت کے طالب ہو۔ خدا کی قسم مجھ سے یہ کبھی نہ ہو گا۔ تمہیں چاہیے کہ میری بیعت کرو کیونکہ رسول کا وارث اور جانشین میں ہوں۔ چنانچہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دنیا سے رخصت بھی ہو گئے لیکن حضرت علیؑ نے کبھی ان کی بیعت نہیں کی۔ (الامامت والیاست ج ۱ ص ۱۳)

تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۱۶ میں ہے کہ جب حضرت علیؑ کو عمر گرفتار کر کے دربار خلافت کی طرف لے چلے تو حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرمایا کہ ابو بکر کو چھوڑ دو، ورنہ بد دعا کے لیے میں اپنے سر کے بال کھول دوں گی۔

طبری کا کہنا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے اس کہنے پر مسجد نبوی کی دیوار قد آدم بلند ہو گئی تھی۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد شیخین سے وقت آخر تک کلام نہیں کیا اور ناراض و غضبناک اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

خالد بن ولید کے مظالم

حضرت ابو بکر نے خالد بن ولید کو حصول بیعت کے لیے اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ جب تم یمامہ اور حضرموت کے مسلمانوں پر غالب آنا اور انھیں قتل کرنا تو ان کی لاشوں کو جلا کر خاک کر دینا۔ قیدیوں اور زخمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دینا اور قتل عام میں کوئی کوتاہی نہ کرنا اور لوگوں کو عبرتناک سزائیں دینا۔

(تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۰۶)

چنانچہ خالد نے ابو بکر کے اس حکم کے تحت دس ہزار مسلمانوں کو قتل کیا اور تمام مقتولین کی لاشوں کو ایک گڑھے میں جمع کر کے نذر آتش کر دیا (تاریخ خمیس ص ۲۳۱)

اسے ختم کرنے اور بزرگ شہر چپ کرانے کی کوشش کی گئی۔ قرآن مقدس اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے نہ کسی ابوبکر کا محتاج ہے، نہ کسی عمر کا، قرآن کی وہ کون سی آیت ہے جس کی رو سے وراثت کے حق کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوالقربیٰ اور اہل بیت نبوت کے لیے منسوخ کیا گیا ہے؟

مشہور سنی عالم ڈبئی نذیر احمد خاں نے اپنی کتاب روایات صادقہ میں فرمایا ہے کہ: ”جو شخص رسولؐ کی وفات سے سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ فاطمہؑ تھیں۔ آپ کی والدہ پہلے ہی انتقال فرما چکی تھیں اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب ہی تھے اور باپ بھی کیسے؟ دین و دنیا کے بادشاہ، ایسے باپ کا سایہ سر سے اٹھنا، اس پر علیؑ کا خلافت سے محروم ہونا، ترکہ پدری فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ ہار جانا، انھیں رنجوں میں گھٹ گھٹ کر انتقال فرما گئیں۔“

پھر تحریر فرماتے ہیں:

”سخت افسوس ہے کہ اہل بیت نبویؑ کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ایسے ناملائم حالات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب و لحاظ جو ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا اور اس میں ضعف آگیا اور شدہ شدہ منہج ہوا اس ناقابل برداشت واقعہ کے بلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے سرزد ہوئی کہ سچ پوچھو تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔“ (روایات صادقہ ص ۱۵۲)

بعض روایتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابوبکر نے فدک کے واگذاشت کا پروانہ لکھ کر سیدہ فاطمہؑ کو دے دیا تھا اور وہ اسے لے کر جانا ہی چاہتی تھیں کہ اتنے میں حضرت عمرؓ آگئے اور انھوں نے معصومہ سے پوچھا کہ یہ کاغذ کیسا ہے،

پدری سے محروم کر دیا ہے اس اندوہ ناک خبر سے آپ بے حد رنجیدہ اور لول ہوئیں، کیونکہ یہ جائداد آپ کو اپنے شفیق باپ سے ہمہ کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی اور آپ رسالت مآب صلعم کی زندگی ہی سے اس پر قابض اور متصرف تھیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے اس غاصبانہ طرز عمل کے خلاف حضرت فاطمہؑ نے اپنے حق کا دعویٰ کیا اور امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ اور حسینؑ کے ہمراہ ام ایمن کو بھی بطور گواہان پیش کیا۔ لیکن وہاں انصاف کا کیا سوال؟ اس لیے کہ عدالت کی کرسی پر جو شخص منصف کی حیثیت سے بیٹھا تھا وہی مجرم بھی تھا چنانچہ آپ کے گواہان کو مسترد کرتے ہوئے آپ کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ (صواعق محرقة ص ۲۳۔ الفاروق ج ۲ ص ۲۲۸)

فدک پر غاصبانہ قبضہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کے مولانا شاہد عظیم فاطمی اپنے ایک طویل مقالہ مطبوعہ سرفراز ۲۸ اگست ۱۹۷۷ء میں علی ابن ابی طالب اور ان کے سیاسی حریف کے عنوان سے فرماتے ہیں کہ:

”ایک فرضی اور سراسر جعلی حدیث کا سہارا لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیکلونی صاحبزادی سیدہ فاطمہؑ زہراؑ کو محض کے ورثہ سے جس طرح محروم کیا گیا وہ بذات خود ایک المیہ ہے۔ سیدہ فاطمہؑ اپنا جائز حق مانگ رہی تھیں اور انھیں ان کے حق سے محروم کرنے کے لیے پیغمبر کا ایک قول گڑھ لیا گیا۔ وضع حدیث کا صریحاً یہ پہلا ارتکاب تھا جو اسلام کے خلیفہ اولؓ نے کیا اور انھوں نے اہل بیت نبوت کو ورثہ نبوت سے محروم رکھنے کے لیے ایک ایسی حدیث وضع کی جو بیسیوں آیات قرآنی اور نصوص قطعیہ کے سراسر خلاف تھی، جس شخص نے بھی اس ظلم اور صریح زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی

ہوا تھا اس لیے وہ آپ کی خصوصی ملکیت تھا۔ دیگر مسلمانوں کا نہ اس میں کوئی حق تھا نہ حصہ۔ چنانچہ طبری نے تحریر فرمایا ہے کہ ”فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص تھا کیوں کہ مسلمانوں نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ۔“

(تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۰۲)

تقریباً یہی عبارت بلاذری کی کتاب فتوح البلدان کے ص ۲۷ پر بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فدک کا علاقہ آنحضرت کو بغیر جنگ کے حاصل ہوا تھا اور مورخین کا اجماع و اتفاق اس امر پر بھی ہے کہ جب فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبضہ اور ملکیت میں آیا تو جبریل امینؑ اللہ کا حکم لے کر حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ اپنے قرابت داروں کو ان کا حق دے دو۔ آپ نے فرمایا میرے قرابت داروں سے مراد کون لوگ ہیں اور ان کا حق اللہ کے نزدیک کیا ہے؟ جبریل نے کہا کہ خدا کا حکم ہے کہ فدک کو فاطمہ کو دے دیجیے۔ چنانچہ آپ نے فوراً فاطمہ زہراؑ کو طلب فرمایا اور تحریری ہبہ نامہ کے ذریعہ فدک کی ملکیت مع قبضہ فاطمہ کے حق میں منتقل کر دی۔

درمنثور مطبوعہ مصر ج ۴ ص ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸ سطر ۱۹ تا ۱۹ درج ہے کہ آنحضرت نے اللہ کے حکم سے فدک فاطمہ زہراؑ کو دے دیا تھا۔ شرح مواقف ص ۳۵ پر بھی تقریباً یہی عبارت تحریر ہے۔ مدارج النبوة ج ۴ ص ۲۲۱ پر بھی ہے کہ فدک کو رسول اللہ نے بذریعہ تحریری ہبہ نامہ فاطمہ کے حق میں منتقل کر دیا تھا۔ کنز العمال ج ۲ ص ۱۰۸ میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ جب آیہ ذوالقربیٰ نازل ہوئی تو پیغمبر نے فرمایا اے فاطمہ فدک تمہارا حصہ ہے۔

لیکن جب حضرت ابو بکر نے تخت خلافت پر قبضہ کیا اور اقتدار کے نشے میں آپ کا شیطانی ایمان ڈنگایا تو آپ نے تمام اسلامی اصولوں کو فراموش کر کے فاطمہ زہراؑ کو بے دخل کر دیا اور فدک پر قابض ہو گئے۔ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے کہ

فرمایا کہ فدک کے داگداشت کی سند ہے جو ابو بکر نے مجھے دی ہے۔ یہ سن کر آپ غصہ سے پاگل ہوا اٹھے اور اسے فاطمہ زہراؑ کے ہاتھ سے چھین کر پارہ پارہ کر دیا ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اسے پیروں سے مل ڈالا اور اس پر تھوکا۔

(سیرت حلبیہ ص ۱۸۵)

فدک کی حقیقت

فدک مدینہ منورہ سے تقریباً پچاسی میل کی دوری پر خیبر کے نواح میں ایک سرسبز و شاداب مقام کا نام تھا۔ جس کا طویل رقبہ زرخیز زمینوں اور باغات پر مشتمل تھا، یہ علاقہ یہودیوں کی ملکیت تھا جو شہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوا۔ سبب یہ تھا کہ یہودیوں کو جنگ خیبر کے بعد پیغمبر اسلامؐ کی طاقت اور قوت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا اور وہ لوگ اپنے مستقبل سے خائف تھے چنانچہ یہ دیکھ کر کہ آنحضرتؐ نے خیبر فتح ہونے کے بعد کچھ یہودیوں کو امان اور پناہ دے کر انھیں چھوڑ دیا ہے، ان لوگوں نے بھی مصالحت اور پناہ چاہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صلح کا پیغام بھیج کر یہ خواہش ظاہر کی کہ فدک کا علاقہ ان سے لے کر انھیں امان و پناہ دے دی جائے۔ رسول اللہ نے ان کی اس درخواست اور خواہش کو منظور فرمایا جس کے نتیجے میں فدک کا علاقہ حاصل ہوا، جو آپ کی تنہا ملکیت قرار پایا کیونکہ دیگر مسلمانوں کا صرف انھیں اموال میں حصہ ہوتا ہے جو جہاد کے موقع پر بطور مال غنیمت حاصل ہوا ہو، اور جو مال بغیر فوج کشی یا بغیر جنگ و جدال کے حاصل ہو وہ مال فے کہلاتا ہے اور وہ سب سے خاصہ خصوصی حق ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ فدک کا علاقہ بغیر جنگ و جدال اور فوج کشی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل

ابوبکر کے زمانے میں آیا تو میں ان کے پاس گیا اور اس مال کا مطالبہ اپنے دعویٰ کے مطابق کیا۔ چنانچہ ابوبکر نے میرا دعویٰ تسلیم کرتے ہوئے وہ مال مجھے مرحمت فرمایا۔

(صحیح بخاری ج ۲، ص ۲۷، ج ۲، ص ۱۹۰)

یہ دعویٰ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ابوبکر کی عدالت میں کسی ایک عادل شخص کا زبانی دعویٰ بھی قابل قبول تھا خواہ وہ اس شخص کے ذاتی مفاد ہی کے لیے کیوں نہ ہو، کیونکہ ابوبکر نے اس مقدمہ میں جابر بن عبد اللہ سے ان کے دعویٰ کی صحت پر کوئی گواہ طلب نہیں کیا۔ اگر محض حسن ظن کی بنا پر بغیر کسی شہادت کے جابر کو مال کا دیا جانا جائز تھا تو ابوبکر کے دل میں رسول کی بیٹی کے لیے یہ خوش اعتمادی کیوں نہیں تھی کہ وہ حصول فدک کے لیے (معاذ اللہ) رسول پر افترا کا الزام نہیں رکھ سکتیں۔ اور اگر فاطمہ زہرا کی طرح گواہان طلب کرنے کا اصول ہمہ گیر اور عام تھا تو اس موقع پر بھی اس کا لحاظ ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ دور پیغمبر میں بھی بعض مواقع پر اس اسلامی اور شرعی اصول کی پابندی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ جب ایک اعرابی نے ایک اونٹ پر آنحضرتؐ سے تنازعہ کیا تو خرمہ بن ثابت نے آپ کے حق میں گواہی دی اور اس ایک گواہی کو دو گواہوں کے برابر تسلیم کیا گیا کیونکہ جس کے حق میں یہ گواہی تھی اس کی صداقت اور دیانت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لہذا جب پیغمبر کی صداقت کے پیش نظر ایک گواہی شرعی اعتبار سے کافی سمجھی گئی تو کیا جناب سیدہ کی اخلاقی عظمت اور راست گفتاری کے تحت حضرت علیؑ اور امّ ایمن کی گواہی کو کافی نہیں سمجھا جاسکتا تھا؟

قاضی نور اللہ شوستری شہید ثالث نے احقاق الحق (باب المطاعن) میں تحریر فرمایا ہے کہ مقررین کا یہ الزام کہ امّ ایمن کی شہادت سے نصاب شہادت نامکمل رہتا ہے، اس بنا پر غلط ہے کہ بعض احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک گواہ اور حلف سے بھی حکم فیصلہ لگانا جائز ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حکم قرآن منسوخ قرار

ابوبکر نے فاطمہ زہرا کے ہاتھ سے فدک چھین لیا اور شہزادی نے جب اپنے حق کا دعویٰ کیا اور فرمایا کہ رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں فدک کو مجھے ہی دیا تھا تو حضرت ابوبکر نے معصومہ کے اس بیان کو ان کی غلط بیانی پر محمول کرتے ہوئے دعویٰ خارج کر دیا۔ امام بلاذری فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؑ نے ابوبکر سے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے فدک مجھے دیا ہے جس پر ابوبکر نے آپ سے گواہان کا مطالبہ کیا اور آپ نے گواہی میں، حضرت علیؑ، امّ ایمن اور حنین کو پیش کیا۔ لیکن ابوبکر نے ان گواہان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

(فتوح البلدان ص ۳۸)

گواہان کے مطالبہ کے ذیل میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی قانون ایسا ہے جس کے تحت بارشہوت اس شخص کے ذمہ ہو جو بذات خود کسی عائد پر قابض و ذیل ہو اور قبضہ کے جواز میں تحریری ثبوت بھی رکھتا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ابوبکر کس حق اور کس قانون کی بنیاد پر شہزادی سے گواہان اور ثبوت کا مطالبہ کر رہے تھے جبکہ معصومہ کا قبضہ بھی تھا اور تحریری ہسب نامہ بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ قبضہ خود ایک محکم دلیل رکھتا ہے۔

ابوبکر کس حیثیت سے فدک پر قابض ہو گئے؟ دراصل یہ ذمہ داری تو ابوبکر پر عائد ہوتی تھی کہ وہ اپنے حق تصرف کے جواز میں کوئی ثبوت فراہم کرتے لیکن وہ کوئی معقول دلیل نہ لاسکے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ابوبکر کے ہی دور میں ان کے سامنے اسی نوعیت کے دیگر مقدمات پیش ہوئے اور انھوں نے بغیر کسی گواہی کے مدعی کے حق میں فیصلہ کیا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ:-

”جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ میں نے ابوبکر کی عدالت میں اس امر کا دعویٰ کیا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر بحرین کا مال آیا تو میں تمھیں اتنا اور اتنا دوں گا مگر پیغمبر کی وفات تک وہ مال نہیں آیا اور جب

اس قول پیغمبر کا علم ابوبکر کے علاوہ دیگر صحابہ میں سے کسی کو بھی نہیں تھا اور نہ کسی نے زبان پیغمبر سے اس حدیث کو سنا۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کی میراث میں اختلاف پیدا ہوا اور کسی کے پاس اس کی کوئی اطلاع نہ تھی کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ ہم گو وہ انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے بلکہ جو چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

عقل اس بات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ اللہ کا برگزیدہ رسول اپنے حقیقی ورثاء کو یہ تک نہ بتائے کہ وہ وارث ہوں گے یا نہیں۔ اور جس شخص کو رسول اللہ کی وراثت سے دور کا بھی کوئی لگاؤ یا تعلق نہ ہو اس کو یہ اطلاع بہم پہنچا دے کہ ہم وارث نہیں چھوڑتے۔ پھر یہ حدیث اس وقت بے نقاب ہو کر منظر عام پر آتی ہے کہ جب فدک کا مقدمہ دائر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حدیث اس وقت کہاں تھی جب حضرت ابوبکر نے جناب فاطمہ زہرا کا حق وراثت تسلیم کرتے ہوئے فدک کے واگذاشت کا پروانہ لکھ کر دیا تھا جسے حضرت عمر نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ معلوم ہوا کہ فدک کے معاملات میں حضرات شیخین کی ملی جھلت تھی اور محض بے ایمانی اور دھاندلی کی بنا پر رسول کی قدسی صفات بیٹی کو اس حق سے محروم کر دیا گیا۔

ابوبکر سے سیدہ فاطمہ زہرا کی ناراضگی

اس ضمن میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں:-

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد چھ ماہ تک حضرت فاطمہ حیات رہیں اور ان کو ابوبکر سے شکوہ رہا اور اپنے انتقال تک ان سے کوئی رسم و راہ نہیں رکھی۔ بہر حال رشتہ داریوں اور جماعتوں میں ایسا بھی ہوتا

پائے کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے حکم فیصلہ صادر ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے بظاہر نہیں ہوتا کہ اگر اس شہادت کے علاوہ کوئی اور معقول دلیل قابل قبول ہے تو اس کی بنا پر فیصلہ ممکن نہیں ہے۔ اس جواب سے یہ امر واضح ہے کہ مدعی اپنے دعویٰ کے اثبات میں اس کا محتاج نہیں ہے کہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی ہی گواہی پیش کرے بلکہ اگر ایک گواہ کے ساتھ حلف بھی اٹھالے تو اس کو دعویٰ میں حق بجانب اور سچا سمجھنا چاہیے اور اس کے حق میں فیصلہ کر دینا چاہیے۔

علامہ متقی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابوبکر، عمر اور عثمان وغیرہ ایک گواہی اور مدعی کی قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔ (کنز العمال ج ۴ ص ۶)

جب ایک گواہ اور مدعی کی قسم پر فیصلہ ہوتا تھا تو حضرت ابوبکر کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی تسلی کے لیے اپنی گستاخانہ جہالت کو بروئے کار لا کر زیادہ سے زیادہ ایک شہادت کے ہمراہ معصومہ سے حلف کا تقاضہ کر لیتے مگر یہاں تو مقصد ہی تھا کہ آپ کی صداقت پر ضرب لگا کر اسے مجروح کر دیا جائے تاکہ آئندہ کسی معاملہ میں آپ سے تصدیق کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو۔

جب اس طرح معصومہ عالم کا دعویٰ مسترد کر دیا گیا تو آپ نے میراث کی بنیاد پر اپنے حق کا مطالبہ کیا جیسا کہ عبدالکریم شہرستانی تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ وراثت کی رو سے اپنے حق کا دعویٰ کیا اور ایک دفعہ ملکیت کی بنیاد پر مگر آپ کو اس مشہور روایت کی بنا پر محروم کر دیا گیا کہ پیغمبر نے فرمایا تھا ہم گمراہ انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے بلکہ جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

(کتاب الملل والنحل ص ۹)

ج ۳ ص ۳۹ میں ہے کہ آپ کی تاریخ وفات ۳ جمادی الثانیہ ۱۱۷۷ء ہے۔

۲۔ حضرت ابوبکر سے حضرت سیدہ فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کو شکوہ رہا اور آپ نے وقت انتقال تک ان سے کوئی راہ و رسم نہیں رکھی۔ ہمیں تسلیم ہے۔

۳۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رشتہ کی حیثیت سے ابوبکر حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی سوتیلی ماں عائشہ کے باپ تھے۔ اس نسبت سے آپ، معصومہ عالمیہ کے سوتیلے نانا ہوئے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ”نانا جان“ کی غیرت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ اقتدار اور دنیا پرستی کی خاطر نانا نیت کے فرائض کو بھول کر اپنی نواسی کی زندگی کو گہوارۂ آلام بنا دیں۔ اس کے شوہر سے بیعت کا تقاضہ کریں اور انکار بیعت کی صورت میں اپنے رفیق و سہمدم حضرت عمر کے ذریعہ اس کے گھر میں آگ لگوا دیں، ترکہ پدری سے اسے محروم کر کے اس کی جائداد (فدک) پر قبضہ کر کے اسے ہڑپ کر جائیں اور اپنے مظالم کی بنا پر اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیں کہ ”مجھ پر وہ مصیبتیں ڈالی گئی ہیں کہ اگر روز ہائے روشن پر ڈالی جاتیں تو وہ سیاہ راتیں بن جاتے“

مولانا ندوی مجھے جواب دیں کہ کیا بشریت کا تقاضہ یہی تھا کہ کیا یقین کی منزل اسی کا نام ہے۔ کیا وہ سچ بھی ہے اور کیا ان مظالم براندام حالات کے بعد عقل سلیم اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ نے ابوبکر اور عمر کو معاف کر دیا ہوگا اور ان سے خوش ہو گئی ہوں گی؟

اصل واقعہ انتہائی اختصار کے ساتھ یوں ہے کہ جب حضرت ابوبکر سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ مقرر ہوئے تو اس کے بعد مسلمانوں سے جبریہ بیعت کی ہم شروع کی گئی، اور اسی ذیل میں ابوبکر کے مونس و سہمدم عمر اپنے غنڈوں کے ہمراہ جناب سیدہ کے گھر پہنچے، حضرت علی کو آواز دی اور کہا کہ اگر باہر نہیں نکلو گے تو میں

ہے اور بشریت کا تقاضہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جس پر یقین رکھتا ہے اور جس کو سچ سمجھتا ہے، اس کے لیے اس کے اندر ایک حساسیت بڑھ جاتی ہے اور جذباتیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک اختلاف ایک حد تک رہا اور حدودِ شرع سے متجاوز نہیں ہوا۔ ان کی مخالفت میں بھی شرافت، سیرتِ نبوی، بلند مہمتی اور صبر کا جوہر قائم رہا۔ کیونکہ یہ اخلاق ان کی سرشت میں داخل تھے۔ حضرت عامر سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی علالت نے شدت کی شکل اختیار کی تو حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کی عیادت کے لیے گئے۔ اجازت طلب کی حضرت علی نے ان سے کہا کہ دروازہ پر ابوبکر کھڑے ہیں، اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کو اجازت دے دوں حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟ کہا ہاں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابوبکر اندر آئے، معذرت کی، گفتگو کی، اور وہ (حضرت فاطمہ) ان سے خوش ہو گئیں۔“

(المرتعی ص ۱۴۲-۱۴۳)

اندوی صاحب کا یہ فرمانا کہ وفات پیغمبر اسلام کے بعد حضرت سیدہ فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا چھ ماہ تک حیات رہیں، نہ جانے تاریخ کی کس کتاب سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ اپنی اس بات کے اثبات میں ندوی صاحب نے کسی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ دنیائے اسلام کے قدیم مورخ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا صرف ۵۷ دن دنیا میں رہیں۔

(الامامت والیاست ج ۱ ص ۱۲)

علامہ بہائی نے تنویر تحریر فرمایا ہے (جامع عباسی ص ۷۵) اور انوار الحنیفہ

اس حدیث کو سن کر حضرت ابو بکر اور عمر دونوں نے اس کی تصدیق کی تب آپ نے فرمایا کہ: ”میں خدا اور اس کے ملائکہ کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض اور غضب ناک کیا ہے، اور جب میں رسول خدا سے ملوں گی تو تم دونوں کی شکایت کروں گی۔“

حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ اے فاطمہ میں آپ کے اور رسول خدا کے عتاب سے اور غضب سے پناہ مانگتا ہوں لیکن حضرت فاطمہ زہرا فرماتی جاتی تھیں اور یہاں تک فرمایا کہ خدا کی قسم میں ہر اس نماز میں کہ جو میں پڑھوں گی تمہارے حق میں بد دعا کرتی رہوں گی۔ (الامامت والیاست ابن قتیبہ مطبوعہ استنبول ص ۱) مذکورہ کتاب جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہے اس کے جزو اول ص ۶ تا ۱۴ پر بھی مذکورہ بالا عبارتیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ ابو الفدا ج ۱ ص ۱۵۴، کتاب سقیفہ ابو بکر جو ہری، تاریخ طبری، کنز العمال، تاریخ اعظم کوئی، روضۃ الصفا، روضۃ الاحباب اور ارجح المطالب اردو ص ۳۱۳ وغیرہ میں بھی یہ صراحت موجود ہے۔

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد خاں دہلوی فرماتے ہیں کہ فاطمہ نے ابو بکر وغیرہ سے بات چیت کرنا چھوڑ دیا تھا اور آخری وقت یہ وصیت کی تھی کہ مجھے رات کے وقت دفن کرنا اور یہ لوگ میرے جنازے پر نہ آنے پائیں (اہبات الائمہ ص ۹۹) علامہ عبد البر لکھتے ہیں کہ فاطمہ کی یہ وصیت تھی کہ حضرت عائشہ بھی شریک جنازہ نہ ہونے پائیں (استیعاب ج ۲ ص ۷۲)۔

جناب سیدہ کی حضرات شیخین کی ناراضگی کے بارے میں مولانا علی میاں ندوی اگر مطمئن نہ ہوئے ہوں تو مزید ملاحظہ فرمائیں۔ ترجمہ صواعق محرقہ ص ۲۱ اشعة اللمعات ج ۳ ص ۸۰، الزہراء، عمر ابو نصر (اردو ترجمہ) ص ۸۹، جمع الفوائد

اس گھر میں آگ لگا دوں گا۔ گھر جلانے کے لیے آپ لکڑیاں بھی لے گئے تھے۔ سیدہ کونین دروازے تک پہنچیں اور پس پردہ رہ کر آپ نے عمر سے فرمایا کہ اے ابن خطاب یہ کیا ظلم ہے کہ تم لوگ ہم سوگواروں کو گھر میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے کیا تمہیں رسول اللہ نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ ہمارا گھر جلا دو۔ حضرت عمر نے کہا خدا کی قسم اگر تم لوگ بیعت نہیں کرو گے میں تمہارا گھر جلا دوں گا۔ حضرت فاطمہ یہ سن کر رونے لگیں اور فرمایا کہ اے پدر بزرگوار، اے رسول خدا، دیکھئے آپ کے بعد ہم پر کیا کیا مظالم ہو رہے ہیں۔ آخر کار حضرت عمر نے فاطمہ کے گھر میں آگ لگا دی اور آپ پر جلتا ہوا دروازہ گرا دیا جس کے نتیجے میں جناب محسن شکر مادر ہی میں شہید ہو گئے۔ حضرت علی کے گلے میں رسی باندھ کر انہیں دربار خلافت میں لے جایا گیا اور ان سے بیعت کے لیے کہا گیا۔ حضرت نے قطعی طور پر ابو بکر کی بیعت سے انکار فرما دیا اس پر حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ اگر آپ بیعت نہیں کرنا چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کرتا۔ اس کے بعد حضرت علی گھر واپس آ گئے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے فرمایا کہ ہم نے فاطمہ کو ناراض کیا ہے، چلو ان کو راضی کر لیں۔ یہ دونوں حضرات فاطمہ زہرا کے بیت الشرف پر آئے اور اپنے افعال و اعمال پر معذرت چاہی۔ معصومہ نے فرمایا کہ میں تمہیں رسول کی ایک حدیث سناتی ہوں کیا تم اس کی تصدیق کرو گے؟ حضرت ابو بکر اور عمر دونوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ میں تم کو قسم دے کر پوچھتی ہوں کہ کیا تم نے رسول اللہ سے یہ حدیث نہیں سنی کہ: ”فاطمہ میری رضا ہے اور غضب فاطمہ میرا غضب ہے۔ جس نے میری بیٹی فاطمہ کو دوست رکھا اس نے مجھ کو دوست رکھا اور جس نے اس کو خوش رکھا اس نے مجھ کو خوش رکھا اور جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھ کو ناراض اور غضب ناک کیا۔“

ج ۲ ص ۱۸ مطبوعہ میرٹھ، ترجمہ صحیح مسلم ج ۵ ص ۲۵، روضۃ الاحباب ج ۱ ص ۴۴۴
ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۵۷ وغیرہ۔

سیدہ کونین حضرت فاطمہ زہرا کی رحلت

مولانا ندوی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ جب حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی علالت نے شدت کی شکل اختیار کی تو حضرت ابو بکر حضرت فاطمہ کی عیادت کے لیے گئے۔ (المقتضی ص ۱۴۳)

حضرت ابن عباس صحابی رسول کا بیان ہے کہ جب فاطمہ زہرا کی رحلت کا وقت قریب آیا تو نہ معصومہ کو بخار آیا، نہ درد سر عارض ہوا، بلکہ آپ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو ساتھ لیا اور قبر رسول پر گئیں اور قبر و منبر کے درمیان دو رکعت نماز پڑھی پھر دونوں کو اپنے سینے سے لگا کر فرمایا کہ اے بچو! تم دونوں تھوڑی دیر اپنے باپ کے پاس بیٹھو۔ امیر المومنین اس وقت مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر وہاں سے گھر آئیں اور آنحضرت کی چادر اٹھائی، غسل کر کے رسول اللہؐ کا بچا ہوا کفن یا لباس پہنا۔ بعد ازاں آپ نے اسماء (زوجہ حضرت جعفر طیار) کو آواز دی اور فرمایا اسماء، تم مجھ سے الگ نہ ہونا، میں ایک ساعت کے لیے اس حجرہ میں جاتی ہوں اور جب تھوڑا وقفہ گزر جائے اور میں باہر نہ نکلوں تو مجھ کو تین آوازیں دینا۔ اگر میں جواب نہ دوں تو تم اندر چلی آنا اور سمجھ لینا کہ میں رسول خدا سے ملحق ہو چکی ہوں۔

اس کے بعد آپ حجرہ میں تشریف لے گئیں اور آنحضرت کی جگہ گھڑی ہو کر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی پھر لیٹ گئیں اور اپنا منہ چادر سے ڈھانپ لیا بعض علماء کا کہنا ہے کہ سیدہ نے حالت سجدہ میں ہی وفات پائی۔ الغرض جب

ایک ساعت کا وقفہ گزر گیا تو اسماء نے آپ کو آواز دی، مگر جواب نہ ملا، تب اسماء اس حجرہ میں داخل ہوئیں اور دیکھا کہ معصومہ رحلت فرما چکی ہیں۔ اسماء نے اپنا گریبان بھاڑ لیا اور روتی پیٹتی گھر سے نکل کر صحن مسجد میں آئیں جہاں حسنینؑ ماں کا انتظار کر رہے تھے۔ بچوں نے اسماء کو روتا دیکھ کر گھر آکر پوچھا کہ اے اسماء، ہماری اماں کہاں ہیں۔ عرض کی کہ حجرہ میں ہیں۔ دونوں شاہزادے حجرہ میں پہنچے دیکھا کہ مادر گرامی دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ شاہزادے روتے ہوئے حضرت علیؑ کے پاس آئے اور انھیں خبر دی۔ آپ صدمہ سے بے حال ہو گئے اور گھر میں تشریف لائے۔ اسماء سر ہانے بیٹھی مصروف گریہ تھیں۔ آپ نے چہرہ انور کو کھول کر دیکھا۔ سر ہانے ایک تحریر دستیاب ہوئی جس میں شہادتین کے بعد وصیت پر عمل کا حوالہ تھا اور یہ تاکید تھی کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے غسل دیکر کفن پہنانا اور رات کے وقت سپرد خاک کرنا اور میرے دشمنوں (ابوبکر اور عمر) کو میری میت پر نہ آنے دینا۔ آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں اور اپنی ان تمام اولادوں (سادات) کو سلام کرتی ہوں جو قیامت تک پیدا ہوتی رہیں گی۔

جب رات ہوئی تو حضرت علیؑ نے غسل دیا، کفن پہنایا، نماز پڑھی اور جنت البقیع میں دفن کیا۔ (زاد العقبیٰ ترجمہ مودۃ القربی علی ہمدانی شافعی ص ۱۲۵ تا ۱۲۹) انوار الحنیہ ج ۳ ص ۳۹ میں ہے کہ آپ منبر اور قبر رسول کے درمیان دفن ہوئیں۔ کتب مقاتل میں ہے کہ غسل کے وقت حضرت علیؑ علیہ السلام نے پشت و بازوئے فاطمہ پر دُرّہ عمری کے نشانات دیکھے تھے اور چیخ مار کر رو دیے تھے۔ صحیح بخاری اور مسلم وغیرہ میں ہے کہ حضرت علیؑ نے ابوبکر وغیرہ کو شرکت کی اجازت نہیں دی اور نماز جنازہ خود پڑھی۔ علامہ عینی شارح بخاری لکھتے ہیں کہ

تھے اور انھیں لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ ایک روایت میں عباس، فضل، حذیفہ اور ابن مسعود کا اضافہ ہے۔ طبری میں ابن زبیر کا بھی تذکرہ ہے۔

(عمدة المطالب ترجمہ مناقب ج ۲ ص ۶۵ مطبوعہ ملتان)

حضرت فاطمہ زہراؑ کے جائے دفن میں اختلاف ہے۔ کوئی جنت البقیع کوئی قبر اور منبر رسولؐ کے مابین اور کوئی گھر اور قبر پیغمبرؐ کے درمیان بتاتا ہے۔ مشہور یہی کہ آپ جنت البقیع میں دفن ہیں۔ لیکن احمد بن محمد بن ابی نصر نے امام رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؑ اپنے ہی گھر میں مدفون ہوئیں اور جب بنی امیہ نے مسجد کی توسیع کی تو آپ کی قبر روضہ رسولؐ کے اندر آگئی۔ (ترجمہ مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۶۹)

انوار الحینہ ج ۱ ص ۵۴ مطبوعہ ممبئی ۱۳۴۶ھ میں ہے کہ ابن مسعود نے جذبہ وہابیت سے متاثر ہو کر قبر معصومہؑ عالم کو منہدم کر دیا۔ شیخ العراقین محمد رضا کا کہنا ہے کہ ابن مسعود نے مکہ میں لو اور مدینہ میں انیس مقامات مقدسہ کو منہدم کر دیا تھا جن میں خانہ سیدہ اور بیت الحزن بھی شامل ہے۔ (اقتباسات چودہ ستارے)

حضرت فاطمہ زہراؑ پیغمبر اسلام کی نظر میں

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں معصومہ کو نین حضرت فاطمہ زہراؑ کی منزلت یہ تھی کہ آپ انھیں ”ام ابیہ“ یعنی اپنے باپ کی ماں کہہ کر مخاطب فرماتے تھے اور جب معصومہ تشریف لاتی تھیں تو آپ سر و قد تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ فاطمہ زہراؑ کی فضیلت میں رسول اللہؐ کی اس قدر حدیثیں موجود ہیں کہ ایک کتاب الگ سے مرتب ہو سکتی

یہ سب کچھ حضرت علیؑ نے فاطمہ زہراؑ کی وصیت کے مطابق کیا تھا۔

الغرض غسل و کفن کے بعد آپ اپنی اولاد اور اپنے اعزاء کے ساتھ جنازہ لے کر روانہ ہوئے۔ کتاب الفتن میں ہے راستہ دیکھنے کے لیے ایک شمع ساتھ تھی اور حضرت زینبؑ جو کافی کم سن تھیں سیاہ لباس میں لپیٹی ہوئی اس سائے میں چل رہی تھیں جو نابوت کے نیچے شمع کی وجہ سے زمین پر پڑ رہا تھا، مودۃ القربی ص ۲۹ میں ہے کہ حضرت علیؑ جب جنت البقیع میں پہنچے تو ایک سمت سے آواز آئی اور کھدی کھدائی قبر نمایاں ہو گئی۔ حضرت علیؑ نے اسی قبر میں جناب فاطمہؑ کی لاش مطہر دفن کی اور زمین اس طرح برابر کر دی کہ نشان قبر نہ معلوم ہو سکے۔ کتاب منتهی الآمال شیخ عباس قمی ص ۱۳۹ میں ہے کہ جب جناب سیدہ کی لاش قبر میں اتاری گئی تو رسول خداؐ کے ہاتھوں کے مانند دو ہاتھ نمودار ہوئے اور انھوں نے جسم مطہر سیدہ کو سنبھال لیا۔ دلائل الامۃ میں ہے کہ چونکہ قبر فاطمہؑ کے ساتھ بے ادبی کا اندیشہ تھا اس لیے چالیس قبریں بنا دی گئی تھیں۔ مناقب ابن شہر آشوب میں ہے کہ چالیس قبریں اس لیے بنائی گئی تھیں کہ صحیح قبر معلوم نہ ہو سکے اور فاطمہؑ کو ستانے والا قبر پر بھی نماز نہ پڑھ سکے ورنہ سیدہ کو اذیت ہوگی۔ اس کے باوجود لوگوں (ابوبکر وغیرہ) نے قبر کھود کر نماز جنازہ پڑھنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں حضرت علیؑ تنگی تلوار لے کر زرد لباس پہنے ہوئے قبر پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت آپ کے منہ سے کف جاری تھا، یہ دیکھ کر لوگوں کی ہمتیں پست پڑ گئیں اور وہ آگے نہ بڑھ سکے۔

علامہ حافظ محمد بن علی شہر آشوب المتوفی ۵۸۸ھ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہراؑ صلوٰۃ اللہ علیہا کے جنازے میں امیر المومنین حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، سلمان فارسی، ابوذر، مقداد، عمار اور بریدہ شریک

خلافت کی واپسی

حضرت ابو بکر کو جب مرض الموت نے اپنے شکنجے میں جکڑا اور انھیں یہ یقین ہو گیا کہ اب بچنا محال ہے تو آپ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ آپ خلافت کو اسی شخص کے حوالے کر جائیں جس کی یہ مرہون منت ہے۔ چنانچہ اپنی علالت کے دوران آپ نے حضرت عمر کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا۔ جب مسلمانوں کو آپ کی اس نیت کا پتہ چلا تو انصار و مہاجرین پر مشتمل ایک وفد طلحہ و زبیر کی قیادت میں آپ سے ملا اور احتجاج کرتے ہوئے آپ سے درخواست گزار ہوئے کہ حضرت عمر انتہائی غلیظ طبیعت کے انسان ہیں اور جب آپ کی موجودگی میں ان کے مظالم کی تلوار کا لوہا ہم مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گرم رہتا تھا تو خلیفہ ہونے کے بعد وہ نہ جانے کیا کریں گے۔ اور ہم یہ اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں کہ آپ ہم پر حضرت عمر کو خلیفہ بنا کر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا وقت آخر ہے اور آپ اللہ کے گھر جا رہے ہیں آخر وہاں کیا جواب دیں گے۔ لہذا آپ اپنے اس ارادے سے باز آئیں۔ (تاریخ الامم والملوک ج ۴ ص ۵۴ الفاروق ص ۲۷ تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۶۹ وغیرہ) لیکن حضرت ابو بکر چونکہ حضرت عمر کی خلافت کے بارے میں اپنے دل میں ٹھکان چکے تھے اور مکمل فیصلہ کر چکے تھے لہذا انھوں نے طلحہ و زبیر وغیرہ کی باتوں پر توجہ دینے کے بجائے انھیں سختی سے جھڑک دیا اور فرمایا کہ یہ لباس خلافت مجھے تم لوگوں نے نہیں پہنایا بلکہ اسے میرے محسن عمر بن خطاب نے مرحمت فرمایا ہے اور میں اس کو انھیں ضرور واپس کروں گا۔ (خلاصہ عبارت ابو بکر، مترجم محمد احمد پانی پتی ص ۴۵۰)

الغرض حضرت ابو بکر کی حالت جب بگڑنے لگی تو آپ نے حضرت عثمان کو

ہے۔ لیکن یہاں مقصد صرف ان حدیثوں کو پیش کرنا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ فاطمہ زہرا کو ایذا پہنچانے والا اللہ اور رسول کی نگاہ میں کیا مقام رکھتا ہے۔

- ۱۔ ارشاد پیغمبر ہے کہ اللہ فاطمہ کے غضب سے غضب میں آتا ہے اور اس کے خوش ہونے سے خوش ہوتا ہے۔ (متدرک حاکم و جامع ترمذی)
- ۲۔ فرمایا رسول خدا نے کہ فاطمہ میرا جزو ہے جس نے اس کو غضب ناک کیا اس نے مجھ کو غضب ناک کیا اور جس نے اس کو ایذا پہنچایا اس نے مجھے ایذا پہنچایا۔
- ۳۔ فرمایا پیغمبر نے کہ فاطمہ میرا دل اور میری روح ہے جس نے اسے ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور کافر ہوا۔

۴۔ فرمایا رسول خدا نے کہ فاطمہ میرا نور، میرا جزو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور فاطمہ کو ایذا پہنچانے والا کافر ہے۔ (صحیح بخاری باب ۱۷ ص ۳۹۰ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰، جامع ترمذی ص ۵۷۷، کنز العمال ص ۹۷، متدرک حاکم ج ۳ ص ۱۵۴)

مذکورہ اقوال پیغمبر سے واضح ہے کہ سیدہ فاطمہ زہرا کو ناراض کرنے والا اور آپ کو ایذا پہنچانے والا کافر ہے اور قرآن بھی کہتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں وہ کافر ہیں اور ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں جگہ اللہ کی لعنت ہے۔

اس اعتبار سے فاطمہ زہرا کی ایذا رسانی کے بعد، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی شخصیت کا تعین مولانا ندوی خود فرمالیں

مولانا ابوالحسن ندوی کا کہنا ہے کہ: ”حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت عمر کو اس لیے نامزد کیا تھا کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ عمر فاروق میں قوت فیصلہ مستقل مزاجی، اصابت رائے اور عقل و رائے کی کجنگی بدرجہ اتم موجود تھی۔“
(المرقزی ص ۱۶۳، ۱۶۴)

بے شک حضرت عمرؓ میں قوت فیصلہ ایسی ہی تھی کہ جس نے ایک منزل میں رسول اللہؐ کا قصہ ہی پاک کر دینا چاہا اور ایک منزل میں اس نے آپ کو رسولؐ کی رسالت پر شک کرنے پر مجبور کر دیا اور مستقل مزاجی کا یہ حال تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی منزل میں آپ کبھی مستقل مزاج نہ رہ سکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ محمد و آل محمدؐ کی دشمنی اور لات و بیل کی پرستش میں ہمیشہ مستقل مزاج رہے، جس کا اعتراف ہمیں بھی ہے۔ اصابت رائے اور عقل و رائے کی کجنگی کے بارے میں صرف اتنا ہی تبصرہ کافی ہے کہ اس نے جب خام سیاست کا لباس زیب کیا تو انسانیت برہنہ ہو گئی۔

واقعہ قرطاس

واقعہ قرطاس کے ذیل میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ:-
”صحیح بخاری میں حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری وقت آیا اس وقت گھر میں کچھ لوگ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آؤ تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم گمراہ نہ ہونے پاؤ۔ کچھ لوگوں نے

بلایا اور کہا کہ قلم دوات اور کاغذ لاؤ اور جو کچھ میں لکھوانا چاہتا ہوں اسے لکھو عثمان کاغذ و قلم لے آئے اور کہا کہ کیا لکھوں۔ فرمایا کہ لکھو، حکم نامہ منجانب ابوبکر بن قحاذ بنام امت مسلمہ، اما بعد.....، ابوبکر اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ حضرت عثمان ابوبکر کا مقصد سمجھ گئے تھے لہذا انھوں نے یہ تحریر فرمادیا کہ میں نے تم پر عمر بن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا اور خیر میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر پوش میں آئے تو انھوں نے عثمان سے کہا کہ پڑھو کیا لکھا ہے جو لکھا تھا اسے عثمان نے پڑھ کر سنا دیا جس پر خوش ہو کر ابوبکر نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور کہا کہ شاید تمہیں بھی اس امر کا خوف پیدا ہوا کہ اگر میں بے ہوشی کی حالت میں مر گیا تو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ عثمان نے کہا کہ ہاں۔ اس پر ابوبکر نے فرمایا کہ اللہ تمہیں جزائے خیر دے (تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۶۳، تاریخ الامم والملوک ج ۴ ص ۲۵، تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۶۸)

حضرت ابوبکرؓ نے اس وصیت نامہ کو اپنے غلام کے ذریعہ عام مسلمانوں میں مشہر کرایا۔ مشہر ہی کے وقت حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ کے غلام کے ساتھ ساتھ رہے۔ طبری کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جسے ہلا ہلا کر یہ کہتے جاتے تھے کہ اے مسلمانو! خلیفہ رسولؐ نے جو کچھ اس وصیت نامہ میں لکھا ہے اسے تمہیں ماننا ہوگا۔ (خلاصہ تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۲) اتمام نعمت میں ہے کہ ڈنڈے کے زور پر یہ بیعت، بیعت بالجبر تھی اسے بالمرغبت نہیں کہا جاسکتا۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ خدا کا رسول جب وصیت کے لیے قلم دوات اور کاغذ طلب کرے تو اس کے اس عمل کو ہذیان سے تعبیر کر دیا جائے اور بستر مرگ پر جب حضرت ابوبکرؓ وصیت لکھوائیں تو اس کو ڈنڈے کے زور سے مسلمانوں پر نافذ کیا جائے۔

نہ ایسی کوئی روایت صحیح بخاری وغیرہ میں میری نظر سے گزری ہے۔ اس لیے مولانا ندوی کی اس گفتگو پر تبصرہ کے بجائے ضرورت اس امر کی ہے کہ واقعہ قرطاس کو از سر نو تاریخی حوالوں کی روشنی میں پیش کیا جائے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع کی واپسی پر اپنی جانشینی کا اعلان حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے حق میں مرضی الہی کے مطابق کہ چکے تھے۔ آخری لمحات میں آپ نے یہ ضروری سمجھا کہ اسے دستاویزی شکل دے دوں۔ چنانچہ آپ نے اصحاب سے فرمایا کہ مجھے کاغذ، قلم اور دوات مہیا کر دو تاکہ میں تمہارے لیے ایسا نوشتہ تحریر کر دوں جو تمہیں گمراہی سے بچائے رکھے۔ یہ سن کر اصحاب میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ لوگوں کے رجحانات قلم و دوات دے دینے کی طرف دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ یہ مرد ہذیان بک رہا ہے، ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے۔ (صحیح بخاری ص ۸۴۲)

علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت کے اس ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا (الفاروق ص ۶۱)

مولوی نذیر احمد خاں دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ ”جن کے دل میں تمنائے خلافت چمکیاں لے رہی تھی انھوں نے تو دھیدکا مشتی سے منصوبہ ہی چٹکیوں میں اڑا دیا اور مزاحمت کی یہ تاویل کی کہ ہماری ہدایت کے لیے قرآن بس کرتا ہے اور چونکہ اس وقت پیغمبر صاحب کے حواس برجا نہیں ہیں۔ کاغذ و قلم و دوات کالانا کچھ ضروری نہیں، خدا جانے کیا لکھوادیں“ (اہبات الامۃ ص ۹۲) اس واقعہ سے آنحضرتؐ کو سخت صدمہ ہوا اور آپ نے فرمایا ”قوموا عتئی، میرے پاس سے چلے جاؤ۔ نبی کے رویہ و شور و غل انسانی ادب نہیں ہے۔

امام ابو الحامد محمد المغزالی لکھتے ہیں کہ غدیر خم میں حضرت رسول کریمؐ کے

کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف زیادہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے، ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔ اس معام میں گھروالے ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے اور آپس میں جھگڑنے لگے۔ ان میں کوئی کہتا تھا کہ (کاغذ قلم، آپ کے قریب کر دو تاکہ تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دیں جس کے بعد تم راہ سے نہ بھٹک سکو۔ کچھ لوگ اس کے خلاف کہہ رہے تھے مگر جب زیادہ گفتگو بڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”چلے جاؤ۔“

(الجامع الصحیح للبخاری کتاب المغازی باب مرض النبی ووفاته)

پھر مزید تحریر فرماتے ہیں:-

”کاغذ طلب کرنے کے بعد تین روز تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں رہے لیکن دوبارہ قلم و قرطاس طلب نہیں فرمایا اور خلافت کے سلسلہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی۔ اس روز متعدد وصیتیں بھی کیں مگر ان میں خلافت کا ذکر نہیں فرمایا۔ آپ نے جو وصیتیں کیں ان میں یہ تھا کہ نماز اور ان لوگوں کا خیال جو تمہاری زیر نگیں (غلام اور باندیاں) ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز، زکوٰۃ اور غلام اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔“

(المقتضی ص ۱۳۲، ۱۳۳)

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنی مذکورہ گفتگو کی دلیل میں صحیح بخاری اور رواہ البیہقی و احمد کا نام تو لیا ہے مگر جلد نمبر اور صفحہ نمبر کی وضاحت نہیں کی جس سے آپ کی بددیانتی ظاہر ہوتی ہے اور گفتگو کی صداقت پر شک ہوتا ہے اور

کو خاندان نبی ہاشم میں نہ جانے دیں گے۔ (مجموع البحرین)
یہ واقعہ حدیث قرطاس کی شکل میں مذکورہ کتابوں میں موجود ہے لیکن
ندوی صاحب کی چشم و ہابیت میں ایسی بصیرت کہاں کہ وہ اسے دیکھ سکے۔

انتقال

حضرت ابوبکر نے دو سال تین ماہ گیارہ دن تخت خلافت پر قابض رہ
کر ۲۲ جمادی الثانی ۳۵ھ مطابق ۲۲ اگست ۶۳۴ء پیر کے دن انتقال کیا۔
آپ کے دور خلافت میں خاص بات یہ تھی کہ توسیع حکومت اور حصول اقتدار
کے نام پر اسلام کا سہارا لے کر تقریباً دو لاکھ اٹھارہ ہزار بے گناہ انسانوں کا
خون بہایا گیا کشت و خون کی اس ہولی میں زیادہ تر خالد بن ولید کا ہاتھ رہا۔
حضرت ابوبکر نے اپنی حیات میں پانچ عورتوں سے عقد جائز کیا۔ آپ
کی کل چھ اولادیں تھیں۔ لڑکوں میں عبد الرحمن، عبد اللہ اور محمد تھے اور لڑکیوں
میں حضرت عائشہ، اسماء اور ام کلثوم تھیں۔ حضرت عائشہ رسول خدا صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں تھیں، اسماء کے شوہر زبیر بن عوام تھے اور ام کلثوم
سے حضرت عمر نے عقد فرمایا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔
حضرت ابوبکر کے والد تمنا نے ۹۷ سال کی عمر پائی تھی۔ ۹۷ھ میں فتح
مکہ کے بعد مسلمان ہوئے اور ۳۵ھ میں انتقال فرما گئے۔ اس طرح آپ نے
کل پانچ سال مسلمان رہ کر ۹۲ سال کفر کی زندگی گزاری۔

مدفن

یہ بات عام طور پر متہو رہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر دونوں ہی رسول اللہ

”من کنت مولاه فهذا علی مولاه“ فرمانے کے بعد اور موقع پر مبارک باد دینے
کے بعد جب لوگوں پر خلافت کی ہوا دھوس غالب آگئی تو انھوں نے عدیر خم
کی تمام باتیں بھلا دیں پھر جب رسول خدا کے انتقال کا وقت آیا تو انھوں نے
وفات سے قبل فرمایا کہ مجھے قلم دوات اور کاغذ دے دو تاکہ میں دستاویزی طور
پر خلافت کے اشکال کو دور کر دوں اور تمہیں تحریر کے ذریعہ بتا دوں کہ میرے
بعد خلافت کا حق دار کون ہے؟ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا کہ اس مرد کو چھوڑ دو
یہ ہذیان بک رہا ہے (سر العالمین ص ۹ مطبوعہ ممبئی) یہ عبارت مختلف الفاظ
میں صحیح بخاری طبع کراچی ج ۱ ص ۱۳۴، ۱۳۵ و ج ۲ ص ۴۹۶ و ج ۳ ص ۸۴۲
۸۴۳ و صحیح مسلم جلد ۵ ص ۷۶ و فتح الباری شرح بخاری عسقلانی ج ۱ ص ۱۲۹ بر حاشیہ
وجز ۸ ص ۱۰۱ نسیم الریاض شرح شفا قاضی عیاض طبع مصر ج ۲ ص ۲۸۸ شرح شفا
ملا علی قاری بر حاشیہ نسیم الریاض، مدارج النبوة طبع کان پور ص ۵۴۲، جیب السیر
ص ۷۹ و مکتوبات شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ج ۲ ص ۴۱-۴۲ وغیرہ میں بھی
ہے۔

انھیں کتابوں کی روشنی میں خواجہ حسن نظامی دہلوی لکھتے ہیں: اسی بیماری
کے زمانہ میں ایک دن بہت سے لوگ حضرت صلعم کے پاس جمع تھے۔ آپ نے ارشاد
فرمایا کہ لاؤ کاغذ میں تم کو کچھ لکھ دوں تاکہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو جاؤ۔ یہ سن کر
(حضرت عمر) بولے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بخار کا غلبہ ہے
اس لیے ایسا فرماتے ہیں۔ وصیت نامہ کی کچھ ضرورت نہیں ہم کو خدا کی کتاب
کافی ہے۔ (محرم نامہ ص ۱۰ مطبوعہ دہلی)

علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، ابو عبیدہ، عبد الرحمن
اور سالم ان پانچ آدمیوں نے خانہ کعبہ میں قسم کھائی تھی کہ پیغمبر کے بعد ہم خلافت

رسولؐ کے ترکہ کی وارث عائشہ اور حفصہ کیوں کر ہو سکتی ہیں جب کہ رسولؐ کی بیٹی فاطمہؑ کو میراث پدری سے محروم رکھا گیا۔

اس مختصر مکالمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حجرہ کے اصل وارث پیغمبر اسلامؐ تھے اور آپ کے بعد آپ کی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہؑ صلوٰۃ اللہ علیہا اس حجرہ کی وارث ہوئیں۔ حجرے کے اندر حضرات شیخین کا دفن کیا جانا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب معصومہ سے اجازت حاصل کر لی گئی ہو، اور معصومہ سے حصول اجازت کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ آپ کا انتقال شیخین سے پہلے ہو چکا تھا۔ اور اگر اس پہلو پر غور کیا جائے کہ معصومہ کی حیات میں ہی ان سے اجازت حاصل کر لی گئی تھی تو اس کا امکان اس لیے نہیں ہے کہ سیدہ فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا شیخین سے ناراض اس دنیا سے رخصت ہوئیں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

معلوم ہوا کہ شیخین یعنی ابوبکر اور عمر کا دفن بھی غاصبانہ ہے۔

حضرت علیؑ کی خاموشی اور اپنے حق کیلئے تلوار نہ اٹھانے کا سبب

بعض نا فہم یہ سوال کر بیٹھے ہیں کہ رسول اللہ کے بعد حضرت علی بن ابی طالبؑ علیہ السلام خاموش کیوں رہے اور آپ نے اپنے حق کی خاطر غاصبوں سے جنگ کیوں نہیں کی؟

یقیناً حالات اسی منزل میں تھے اور اس جان لیوا ماحول اور سخت گیر مصائب کے عالم میں امیر المومنین کی جگہ عام ذہن و فکر کا کوئی دوسرا انسان ہوتا تو خوزیری لازمی تھی۔ لیکن اس سخت ترین منزل میں حضرت علیؑ کی حکیمانہ خاموشی نے دور اندیشی اور مصلحت مبینی سے کام لے کر نہ صرف رسولؐ کی محنتوں اور مشقتوں کو رانگال

کے ارد گرد حجرہ عائشہ میں دفن ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس حجرہ میں یہ لوگ دفن ہیں کیا وہ واقعی عائشہ کی ملکیت تھا؟ اس کے جواب میں صاحب کتاب اصحاب ثلاثہ نے ج ۱ ص ۵۱ تا ۵۳ امام ابوحنیفہ اور فضال کو فی کا ایک دلچسپ مکالمہ نقل کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

فضال کو فی: اے ابوحنیفہ میرا ایک بھائی ہے جو حضرت علی بن ابی طالبؑ کو شیخین (حضرت ابوبکر و عمر) سے فضل سمجھتا ہے۔

ابوحنیفہ: شیخین کی افضلیت تو پہلے رسولؐ میں دفن ہونے سے ہی ظاہر ہے۔ فضال کو فی: یہ بات میں نے اپنے بھائی سے کہی تھی، مگر وہ کہتا ہے کہ اگر وہ حجرہ آنحضرتؐ کی ملکیت تھا تو دونوں نے اس میں دفن ہو کر ظلم کیا اس لیے کہ انھیں رسول اللہ کے حجرہ میں دفن ہونے کا کوئی حق نہیں تھا اور اگر وہ حجرہ شیخین ہی کا تھا اور انھوں نے رسولؐ کو ہبہ کر دیا تھا تو ہبہ کے بعد بغیر اجازت رسولؐ اس پر تصرف ناجائز تھا اور رسول اللہ سے اجازت کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ آپ کا انتقال شیخین سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

ابوحنیفہ: وہ حجرہ شیخین کی تدفین کے وقت نہ شیخین کا تھا نہ رسول اللہ کا، بلکہ شیخین اپنی اپنی بیٹیوں عائشہ اور حفصہ کے حصہ میں دفن ہیں۔

فضال کو فی: یہ بات بھی میں نے اپنے بھائی سے کہی تھی مگر اس نے جواب دیا کہ تم تو جانتے ہو کہ آنحضرتؐ کی نوبیویاں تھیں لہذا شریعت محمدی کی رو سے اس حجرہ کے آٹھویں حصہ کی وارث حفصہ اور نویں حصہ کی وارث عائشہ قرار پاتی ہیں، اور ان دونوں کی زمین کا رقبہ دو بالشت سے بھی کم ہوتا ہے، لہذا اتنی تنگ جگہ میں دو طویل القامت آدمی کیونکر دفن ہو گئے اور عائشہ و حفصہ کے علاوہ دیگر سات بیویوں سے اجازت کیوں نہیں لی گئی؟ اس کے علاوہ

کا سامان فراہم کیا اور دوسری طرف اپنے حق کو خوں ریزیوں سے داغدار نہ ہونے پایا۔
جہاں رگ و پے میں شجاعت کا خون دوڑ رہا ہو اور سینے میں غیظ و غضب
کی چنگاریاں بھڑک رہی ہوں وہاں ولولہ انتقام کو دبا کر عفو و بخشش کا طرز عمل
اختیار کرنا اور طاقت کے ہوتے ہوئے درگزر سے کام لینا بڑی کٹھن اور امتحانی
منزل ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں سے
کہہ دیا تھا کہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اٹھ چکے ہیں۔ مجھ سے خلافت کے بارے
میں کوئی نزاع نہ کرے، لیکن ان لوگوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ خدا کی قسم اگر دین میں
تفرقہ پڑنے اور کفر کے پلٹ آنے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ان کی ساری کارروائیاں
آن واحد میں پلٹ دیتا۔ (استیعاب ج ۱ ص ۱۸۳ مطبوعہ حیدرآباد)

فتح الباری فی شرح بخاری ج ۲ ص ۲۰۴ سے واضح ہے کہ حضرت علی نے اسی
طرح چشم پوشی اختیار کی جس طرح کفر کے پلٹ آنے کے خوف سے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم منافقین کے ساتھ کرتے تھے۔ چنانچہ تفسیر کبیر ج ۲ ص ۶۸۶، سیرت
محمدیہ ص ۳۵۶، سیرت حلبیہ ص ۳۶۰ اور تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۳۹ وغیرہ میں ہے کہ
آنحضرتؐ، عائشہ سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر تیری قوم نو مسلم نہ ہوتی تو میں اس کے
ساتھ وہ سلوک کرتا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ چونکہ حضرت رسول خدا اور حضرت علیؑ
لازم و ملزوم تھے۔ لہذا جن وجوہ کی بنا پر رسول اللہ نے ان منافقوں سے جنگ نہیں
کی، انھیں وجوہ کی بنا پر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے تلوار نہیں اٹھائی۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت ابوسفیان مدینہ میں
موجود نہیں تھا۔ کہیں سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اس الم ناک واقعہ کی
خبر ملی۔ اس نے پوچھا کہ مسلمانوں کی قیادت و امارت کسے ملی؟ بتایا گیا کہ لوگوں نے

ہونے سے بچا لیا بلکہ اسلام کی کشتی کو فنا کے گرداب اور طوفان سے نکال کر اُسے
دامحی اور ابدی زندگی دے دی۔

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ حضرت علیؑ کی دلیری ہمت اور شجاعت
کا یہ عالم تھا کہ فوجوں کے ریلے آپ کے ثبات قدم کو جنبش نہ دے سکتے تھے۔ ہر
معرکہ کی فتح یا جی اور کامرانی کا سہرا آپ ہی کے سر رہا کرتا تھا اور بہادر سے بہادر
نبرد آزما بھی آپ کی تلوار سے بچ کر جانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا۔ آپ نے جس سے
بھی مقابلہ کیا اسے پچھاڑے بغیر نہ چھوڑا۔

شجاعوں کی منجی طبیعتیں سوچ بچار کی عادی نہیں ہوا کرتیں اور نہ مصلحت
بینی و مال اندیشی سے انھیں کوئی لگاؤ ہوتا ہے۔ مگر آپ میں شجاعت کے ساتھ سچ
بوجھ کا مادہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ چنانچہ امام شافعی کا قول ہے کہ میں اس ہستی کے
بارے میں کیا کہوں جس میں تین صفتیں ایسی تین صفتوں کے ساتھ جمع تھیں جو آج تک
کسی بھی انسان میں جمع نہیں ہوئیں (۱) فقر کے ساتھ سخاوت (۲) شجاعت کے ساتھ
تدبر (۳) علم اور رائے کے ساتھ عملی کارگزاریاں۔

اسی اصابت فکر و صحت رائے کا نتیجہ تھا کہ پیغمبرؐ کی وفات کے بعد ابوسفیان
نے آپ کو اپنے حق کے لیے تلوار اٹھانے کا مشورہ دیا اور فوجوں کی فراہمی کا وعدہ
کیا تو آپ نے اس کے مشورہ کو ٹھکرا دیا حالانکہ ایسے موقعوں پر بہادروں کو ابھارنے
کے لیے ذرا سا بھی سہارا کافی ہوتا ہے، مگر آپ کی طبع دور اندیش نے فوراً یہ نتیجہ
اخذ کر لیا کہ اگر اس وقت معرکہ کا رزار گرم ہو گیا تو سارا مدینہ خون میں ڈوب
جائے گا اور اسلام کی آواز تلواروں کی جھنکار میں دب کر رہ جائے گی اور پھر کامیابی
حاصل ہوئی تو یہی کہنے میں آئے گا کہ تلوار کے زور سے اس منصب کو حاصل کیا
ورنہ کوئی استحقاق نہ تھا۔ لہذا آپ نے تلوار روک کر ایک طرف تو اسلام کی حفاظت

ریشہ دو انیاں اپنا کام کرتیں اور اسلام کی کشتی ایسے گر داب میں پڑ جاتی کہ پھر اس کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا۔

(اقتباسات پنج البلاغہ)

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711
MAIL : devjani@netcourrier.com

ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ یہ سن کر عرب کا مانا ہوا فتنہ پرداز سوچ میں پڑ گیا اور آخر کار ایک تجویز لے کر عباس ابن عبد المطلب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ دیکھو ان لوگوں نے دھاندلی مچا کر خلافت ایک نبی کے حوالے کر دی ہے اور نبی ہاشم کو ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ خلیفہ اپنے بعد بنی عدی کے ایک درشت خراج کو ہمارے سروں پر مسلط کر جائے گا۔ چلو، علی ابن ابی طالب سے کہیں کہ وہ گھر کا گوشہ چھوڑیں اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ چنانچہ وہ عباس کو لے کر علی کی خدمت میں آیا اور کہا کہ آپ ہاتھ بڑھائیں، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ اگر کوئی مخالفت پر آمادہ ہوا تو میں مدینہ کی گلیوں کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔

امیر المومنین علیہ السلام کے لیے یہ انتہائی نازک مرحلہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنی جگہ پیغمبر کے صحیح وارث و جانشین تھے اور ابوسفیان جیسا جتنے قبیلے والا آپ کے سامنے کھڑا تھا جو ہر طرح آپ کی مدد پر آمادہ تھا صرف ایک ہی اشارہ کافی تھا کہ جنگ کے شعلے بھڑکنے لگتے۔ مگر امیر المومنین کے تدبیر نے مسلمانوں کو فتنہ و فساد اور کشت خون سے بچا لیا اور آپ کی دور رس نظروں نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ قبائلی تعصب اور نسلی امتیاز کو ابھار کر خون ریزی کرانا چاہتا ہے تاکہ اسلام میں ایک ایسا زلزلہ آئے اور خون کا ایسا دھاک ہو جو اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے۔ لہذا آپ نے اس کی تجویز کو نہایت سختی سے ٹھکرا کر اسے چھڑک دیا۔

اس موقع پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خاموشی، مصلحت بینی اور دور اندیشی اصابت فکر کی آئینہ دار تھی۔ کیوں ان حالات میں اگر مدینہ مرکز جنگ بن جاتا تو اس کی آگ سارے عرب کو اپنے لپیٹ میں لیتی اور مہاجرین انصار میں جس رنجش کی ابتدا ہو چکی تھی وہ بڑھ کر اپنے انتہا کو پہنچ جاتی۔ منافقین کی

بنی ہاشم

مذکورہ عنوان کے تحت مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں :-

”قریش کی شاخ اپنے انسانی شعور اور اعتدال پسندی میں امتیاز رکھتی تھی۔ دینی اور دماغی طور پر بھی اس کو کسی قدر فوقیت حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مقام و مرتبہ تھا اس پر بختہ ایمان رکھتی تھی۔ گناہ کو سمجھنے کا شعور ختم نہیں ہوا تھا۔ ہٹ دھرمی اور ضد اس کا شعار نہیں تھا۔ ہمت بلند تھی۔ کمزوروں اور ضعیفوں پر رحم و شفقت کا برتاؤ کرتی تھی۔ سخاوت و شجاعت اس کا مزاج تھا۔ غرض اخلاق و شرافت، سیرجشی، حمیت اور جوش عمل کی وہ خصوصیات جس کے لیے عربی میں ایک جامع لفظ ”فروسیت“ کا ہے، بنی ہاشم میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کے اخلاق و سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء و اجداد کے شایان شان تھے اور اسلام نے جن اخلاق عالیہ کی دعوت دی ہے ان سے ان کے اخلاق مناسبت رکھتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ تک وہ اپنی قوم و ہم وطن قبائل کے عقائد جاہلیت اور غیر اللہ کی عبادت میں شریک ہو گئے تھے“

(المرآۃ ص ۳۱-۳۲)

خط کشیدہ عبارت میں مولانا ندوی نے اپنے جس موقف اور مقصد کو جاگ کر کرنے کی کوشش کی ہے اس کا کوئی وجود تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا اور نہ بنی ہاشم پر اس الزام تراشی کے جواز میں کسی مورخ کے قلم میں جنبش ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی اسناد سے مایوسی کے بعد مولانا موصوف نے خود اپنی ہی کتاب کا حوالہ پیش کر کے اپنے دل کی تسلی کر لی۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مولانا کا یہ عمل اور طریقہ کار عام مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا کرنے اور انھیں دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ بہر حال --- یہ ایک کلیہ، ایک حقیقت، دنیاوی مشاہدہ اور اصول فطرت ہے کہ انسان کے طور و طریقوں، طرز حیات و معاشرت، اخلاق و تہذیب، خصائل و شمائل عادات و اطوار اور سیرت و کردار کا سرمایہ وراثتاً اس کی اولادوں اور نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ لہذا بنی ہاشم کی فضیلت اور ایمانی منزلت کو زیر بحث لانے سے قبل خود جناب ہاشم کی ایمانی منزلت اور فضیلت کو بھی دیکھنا ضروری ہے تاکہ مکمل وضاحت ہو سکے۔

عالم اسلام میں شاید ہی کوئی بد نصیب ایسا ہوگا کہ جس کو جناب ہاشم سے تعارف نہ حاصل ہو۔ جناب ہاشم کے والد عبدمنان کے چھ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے ہاشم اور عبد الشمس تھے۔ کیونکہ یہ جڑواں پیدا ہوئے تھے اور صورت حال یہ تھی کہ جناب ہاشم کے پاؤں کا پنجہ عبد الشمس کی پیشانی سے چپکا ہوا تھا جس کو تلوار سے کاٹ کر فصل قائم کیا گیا تھا۔ یہ ابتداء ہے اس انتہائی جس کے لیے حق و باطل کی مثال ہی درست ہو سکتی ہے۔ عاتکہ بنت مرہ وہ محترمہ تھیں جن کا بطن اس گوہر نایاب کا صدف بنا۔ سب سے چھوٹے بھائی مطلب تھے جو آپ کے ساتھ صلبی و بطنی ربط رکھتے تھے۔

عبدمنان کی اولادوں میں جناب ہاشم کی ہستی وہ ہستی تھی جو اپنے کردار

تدبیریں اور تجویزیں جناب ہاشم کے ہاتھوں منزل کمال تک پہنچیں۔

حرم (خانہ کعبہ) کے انتظامی معاملات میں جناب ہاشم کے دادا قحی کے زمانے سے ہی کچھ شکایتیں چلی آ رہی تھیں جو عبدالدار کے دور میں بھی باقی رہیں، بلکہ حالات نے وہ موڑ اختیار کیا کہ جناب ہاشم مداخلت کے لیے مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے بھائیوں کو جمع کر کے اصلاحی امور ان کے سامنے پیش کیے۔ چونکہ جناب ہاشم کی تجاویز میں حرم کی خدمات کا بے لوث جذبہ کار فرما تھا۔ اس لیے کسی نے مخالفت نہ کی اور سب نے بالاتفاق یہ منظور کیا کہ بنی عبدالدار سے حرم کے انتظامات واپس لے لیے جائیں۔ چنانچہ عبدالدار کی اولادوں کو حرم کی خدمتیں واپس کرنے کا پیغام بھیجا گیا۔ ان لوگوں نے قطعی انکار کر دیا جس کے سبب سے باہمی اختلاف پیدا ہوا۔ یہ اختلاف یقیناً معرکہ کارزار گرم کر دیتا اگر اس طرح مصالحت نہ ہو جاتی کہ سقایت، وفادت اور دارالندہ کے خدام جناب ہاشم کے پاس رہیں اور حجابہ و لواء کے معاملات کا انتظام بنی عبدالدار کریں۔ ان تینوں خدمات کو جناب ہاشم نے جس خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ آج تک یادگار ہیں۔

چنانچہ ابن سعد طبقات میں تحریر فرماتے ہیں:-

”تمام قبیلہ قریش میں جناب ہاشم ایک مرفہ الحال بزرگ تھے۔ جب واردان حرم کی ضیافت اور سقایت ان کے سپرد ہوئی تو آپ نے قریش کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم اللہ کی جانب سے حرم کے پاس بان و نگہبان ہو اور زمانہ حج میں جو بھلاؤ حاجیوں کا یہاں ہوتا ہے وہ سب تمہارے جہان ہیں۔ خدا کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ان کی خدمت کا موقع فراہم کیا ہے لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے جہانوں اور زائرین کا احترام کریں اور نہایت سیرجشی کے ساتھ ان کی

کی بدولت ساری دنیا پر چھا گئی۔ آپ کے جسم کا ایک ایک تار اسماعیلی رشتہ کا منظر تھا اور اکثر و بیشتر یہ ہداے حق آپ کے کانوں سے ملکر آیا کرتی تھی کہ اے ہاشم! تمہیں مبارک ہو کہ اشرف موجودات کا نظور تمہاری ہی نسل سے ہوگا۔

برہنہ لوگوں کو لباس عطا کرنا، بھوکوں کو سیر کرنا، تنگ دستوں کی دستگیری کرنا، بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کرنا اور قرض داروں کا بوجھ ہلکا کرنا آپ کا شیعہ تھا۔ جب آپ کوئی دعوت کرتے یا معمولاً درس خوان بچھاتے تو جہانوں سے جو بچ جاتا تھا وہ دیگر مخلوق خدا کے لیے ہوتا۔ جناب ہاشم کی اس گرم گسٹری اور جہان نوازی کی عکاسی اس دور کے شاعروں نے بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے کہ اگر کبھی مکہ جانے کا موقع فراہم ہو تو ہاشم کے گھر جانا اور جب تو ان کے دروازے پر پہنچے گا تو جو دو کرم کے ہاشمی مظاہرات تیری آنکھوں کو خیرہ بنا دیں گے۔ عالی ظرفی کا سمندر تجھ کو اپنی آغوش میں لے لے گا اور تو ہاشمی فضیلت و منزلت کو دیکھ کر دنگ رہ جائے گا۔

جناب ہاشم کے یہی وہ خدوخال تھے جسے دیکھنے کے لیے قصر شام و روم اور نجاشی شاہ حبش کی گردنیں بلند تھیں اور یہ لوگ اپنے یہاں عقد کے خواستگار تھے جس کو جناب ہاشم کی عظمت نے پست سمجھا۔

قریش کا دور ارتقا اگرچہ قصی ابن کلاب سے شروع ہوتا ہے لیکن حقیقت وہ ابتدا تھی۔ اصول ارتقا کے مطابق کسی بھی قوم اور ملک کی تہذیب اور تکمیل ایک وقت میں ممکن نہیں ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک بہت سے طوفان دیکھنے پڑتے ہیں۔ جناب قصی کی صلاحیت اور لیاقت کا ہر صاحب نظر معترف ہے۔ انھوں نے اپنی کارگزاری کے دور میں بہت کارآمد تدبیریں سوچیں اور اکثر کو جامہ عمل پہنانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ساری

تاریخ ابوالفداء میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے جبریل امین نے بیان کیا کہ میں نے تمام عالم چھا ڈالا مگر کسی کو خدا کے حبیب سے افضل و بہتر نہ پایا اور زمین کا چہرہ چہرہ دیکھ ڈالا مگر کسی باپ کی اولاد بنی ہاشم جیسی نہ ملی۔ الغرض جناب ہاشم اور بنی ہاشم کی فضیلت میں سیکڑوں روایتیں کتابوں میں موجود ہیں جو ان کی حق پرستی اور حق بنی کی منظر ہیں۔ مگر انھیں نظر انداز کر کے ان بندگان خدا پر تہمت شرک ندوی صاحب کا وہ کارنامہ ہے جو ہمارے لیے انتہائی دل آزار اور قابل مذمت ہے۔

حضرت عبدالمطلب

حضرت عبدالمطلب کے حالات میں فاضل مولف نے ایک جملہ تحریر فرمایا ہے جو اہل اسلام کے لیے قابل التفات ہے اور انھیں دعوت فکر دیتا ہے تحریر فرماتے ہیں:-

”ابراہم کے سپاہی عبدالمطلب کے دوستوں نے بھگا کر لے گئے عبدالمطلب اس سے گفت و شنید کے لیے گئے، اس کے دربار میں جانے کی اجازت لی۔ ابراہم نے ان کی تعظیم کی، اپنے تخت سے اتر کر فرش پر اپنے ساتھ بٹھایا اور پوچھا کہ کیا حاجت ہے جس کے لیے تکلیف کی عبدالمطلب نے فرمایا کہ میری حاجت یہ ہے کہ تمہارے آدمی میرے دوستوں کو بھگا کر لے آئے ہیں وہ واپس کر دو۔ عبدالمطلب کی زبان سے یہ بات سن کر ابراہم نے حقارت آمیز نظروں سے ان کو دیکھا اور بولا: تم دوستوں کو بھگا کر لے آئے ہو اور اس گھر کو فراموش کر رہے ہو جس سے تمہارا درتھا ہے آئے ہو اور اس گھر کو فراموش کر رہے ہو جس سے تمہارا درتھا ہے۔“

ضیافت کے فرائض کو انجام دیں۔ اس تقریر و تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے بڑے پیمانے پر فادہ کا سامان شروع کیا اور ہر امیر و غریب نے اپنی استطاعت کے مطابق اس خدمت کے لیے جو ممکن ہو سکا وہ نذر کیا۔ جناب ہاشم خود بھی اپنے سرمایہ سے اس مصروف کے لیے مال کثیر نذر کیا کرتے تھے۔ آپ نے حجاج کو آب رسانی کے لیے چمڑے کے بڑے بڑے حوض بنوائے تھے جو زمزم کے پاس رکھ دیے جاتے اور مکہ کے کنوؤں کے پانی سے لبریز کر دیے جاتے تھے اور دل کھول کر حاجیوں کی ضیافت کی جاتی۔“

ہاشمی فیاضیوں کے یہی وہ غیر فانی نقوش تھے جو عالم کے گوشے گوشے پر ثبت ہو چکے تھے اور تمام لوگ آپ کی ذاتی عظمت اور وجاہت سے اثر پذیر تھے۔ جہاں جہاں سے لوگ آتے وہاں وہاں ان کے وسیع دبستر خوانوں، کشادہ دیگوں اور شکم نواز پیالوں کا چرچا ہوتا رہتا اور شکر کے جذبات نظموں اور بلند بانگ خطبوں میں دھل کر خاموس فضا میں گونجا کرتے تھے۔

قحط سالی کے دور میں اہل عرب پر جناب ہاشم کے ناقابل فراموش احسانوں کا تذکرہ طبقات کے صفحات میں موجود ہے۔ اور انھیں ہاشم کی نسل بنی ہاشم کہلاتی جو ہر اعتبار و ہر زاویے سے اوصاف و صفات ہاشمی کی ورثہ دار تھی۔ چنانچہ بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے بنی کنانہ سے قریش کا انتخاب کیا اور قریش میں بنی ہاشم کو پسند فرمایا۔

قاصی عیاض نے ”شفاء“ میں لکھا ہے کہ اللہ نے اولاد ابراہیم میں اسماعیل کو، اسماعیل میں قریش کو، قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں آنحضرت کو منتخب روزگار قرار دیا۔

آباد و اجداد کا دین وابستہ ہے اور جس کو میں منہدم کرنے آیا ہوں۔

(المصطفیٰ ص ۳۳-۳۴)

خط کشیدہ عبارت میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا (حضرت عبد المطلب) کی شان میں گستاخی کی جسارت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مولانا ندوی کی وہابیت پر ”رشدیت“ کا بغیر بھی ہے۔

آپ نے اس انداز سے ابرہہ کا عبد المطلب کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھنے کو پیش کیا ہے گویا خود آپ بھی بہ نفس نفیس ابرہہ کے پاس موجود تھے اور اس کی نظروں کا جائزہ لے رہے تھے کہ وہ کس نظر سے جناب عبد المطلب کی طرف دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کی کسی کتاب میں اس اہانت آمیز جملے کا کوئی وجود نہیں ہے اور نہ کوئی مورخ ایسا گستاخ تھا کہ وہ رسول اللہ کے جد بزرگوار کے بارے میں اپنی اس مبتذل رائے کا اظہار کرتا۔ بہر حال ان تحقیر آمیز کلمات کے ذمہ دار ندوی صاحب خود ہیں اور جو اصل واقعہ ہے اس کی وضاحت میں کیے دیتا ہوں۔

مورخین نے خانہ کعبہ پر ابرہہ کے لشکر کشی کے واقعات کو یوں تحریر کیا ہے کہ اہل مکہ کے تجار کا ایک گروہ بغرض تجارت حبشہ گیا تھا۔ وہاں ان میں سے کچھ لوگ عیسائیوں کی ایک عظیم الشان عبادت گاہ کے قریب قیام پذیر ہوئے اور آگ جلا کر کھانا تیار کیا۔ جب جانے لگے تو آگ بجھا کر جانے کے بجائے یوں ہی چھوڑ گئے، جس سے چنگاری بھڑکی اور اس عبادت گاہ میں آگ لگ گئی۔ چنانچہ وہاں جو کچھ بھی تھا وہ سب جل کر خاک ہو گیا۔

یہ خبر جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو معلوم ہوئی تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا اور اس نے اپنے وزیر اعظم ابرہہ بن صباح کو بلا کر یہ حکم دیا کہ تم ابھی مکہ روانہ

ہو جاؤ اور وہاں جا کر اہل مکہ کی عبادت گاہ (خانہ کعبہ) کو اسی طرح سمار اور خاک کر دو جس طرح ان لوگوں نے ہماری عبادت گاہ کو تباہ کیا ہے۔ بغرض کہ ابرہہ کے ساتھ ایک لاکھ درندہ صفت انسانوں کی فوج جس میں چار سو جنگجو ہاتھی بھی شامل تھے مکہ کی طرف روانہ ہوئی، اور فوجوں کا یہ سیاہ بادل کوہ و دشت کو عبور کر کے سبزین بطن پر وارد ہوا۔ فوج کی کثرت اور ہاتھیوں کا جم غفیر دیکھ کر اہل مکہ گھبرا گئے اور جائے عافیت کی تلاش میں پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے۔ اس وقت پیغمبر اسلام کے جد بزرگوار اور پاسبان حرم حضرت عبد المطلب نے انھیں تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ اطمینان رکھو، اللہ کے گھر کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اس لیے کہ وہی اس کا نگہبان ہے اور اس کی طاقت و توانائی کے سامنے تمام دنیا کی طاقتیں، سچ ہیں۔ اگر تم پہاڑوں پر جانے کے بجائے حرم ہی کو جائے عافیت بنا لو تو تمام آفتوں سے بچ سکتے ہو۔ لیکن حضرت عبد المطلب کے اس یقین دلانے کے باوجود لوگوں کے اکھڑے ہوئے قدم نہ جم سکے، سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف کلید بردار کعبہ اور آپ کے گھر کے افراد باقی بچے۔ عبد المطلب نے خانہ کعبہ کے ماحول کو سناں دیکھ کر بارگاہ الہی میں عرض کی کہ میرے مالک اب تو ہی ہمارا معین و مددگار ہے اور یہ گھر (خانہ کعبہ) تیرا ہے، تو ہی اس کا محافظ ہے اور میں تجھے واسطہ دیتا ہوں اپنے جد ابراہیم کا کہ اس کو تمام آفتوں سے محفوظ رکھ۔ حضرت عبد المطلب کی یہ دعا تمام ہوئی اور پیشانی قدرت پر ابرہہ اور اس کی فوج کے لیے قہر و غضب کی شکنیں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔

اسی درمیان حضرت عبد المطلب کو یہ خبر ملی کہ ابرہہ کے سپاہی آپ کے دو سو اونٹ زبردستی بھگالے گئے ہیں۔ آپ نے نہایت پراعتماد لہجہ میں فرمایا کہ میرے ناقول میں وہ نائقے بھی شامل ہیں جو اللہ کی امانت ہیں اور زائران حرم

زحمت کشی کا سبب پوچھا۔ عبد المطلب نے فرمایا کہ کعبہ اور حرم کے بارے میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے اس لیے کہ وہ اللہ کا گھر ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرے گا البتہ تمہارے سپاہی میرے دو سواوٹ لائے ہیں اگر چاہو تو انھیں واپس کر دو۔ فوراً ابرہہ نے حکم دیا اور وہ واپس ہوئے۔ اس کے بعد ابرہہ نے پھر پوچھا کہ اور کچھ مانگنا ہو تو مانگو، یہ گویا شکیت کا مظاہرہ تھا۔ یقین کیجئے کہ ایسے موقع پر اگر عبد المطلب کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ خانہ کعبہ کے لیے کچھ کہہ جاتا۔ مگر حضرت عبد المطلب اپنے یقین کامل کے آئینہ میں حرم کا درختاں مستقبل دیکھ رہے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آئندہ یہ جھگڑا باقی رہے، اور آج ہی ایسی فیصلہ کن جنگ ہو جائے جو جا رہا نہ اقدام کے تصور کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے کر دے۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ دشمن کے استقلال میں خود ایک تزلزل پیدا ہو چکا تھا اور اس کو اپنی فتح مشکوک نظر آرہی تھی۔ چنانچہ جب دوبار عبد المطلب نے فرمایا کہ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا تو ابرہہ نے کہا کہ حرم کے لیے مجھ سے کیوں نہیں کہتے؟ مگر عبد المطلب نے جواب میں وہی کہا کہ اس کا ایک کار ساز ہے اور وہ بہتر جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے؟

حضرت عبد المطلب کا یہ جواب دراصل دشمن کے تقاضہ کا جواب نہیں تھا بلکہ ان الفاظ کے ذریعہ آپ نے وجود خدا اور اس کی وحدانیت کی بیامبری کی تھی۔ آخر میں ابرہہ نے کہا کہ کہو تو تمہارے شہر سے واپس چلا جاؤں۔

ہاشم کی یادگار کار ساز کعبہ کا محرم راز تھا، تقدیر کعبہ سے اس کے ضمیر کی آواز بھلا کیونکر متصادم ہو سکتی تھی۔ وہ اگر کہہ دیتا تو ابرہہ ضرور واپس چلا جاتا لیکن اہل مکہ کو اہل حبشہ کے بار ارحمان سے دہنا پڑنا اور کعبہ کی

کی تواضع کے لیے مخصوص ہیں۔ میں انھیں ابرہہ سے واپس لوں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے دوش پر رد اڈالی، پٹکا باندھا اور ایک ناقہ پر سوار ہوئے۔ عزیزوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے۔ فرمایا کہ میں اس ظالم سے ملنا چاہتا ہوں جس کے سپاہیوں نے اللہ کے مال پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس مال کو واپس لاؤں، یہ سن کر تمام اقارب سدا راہ ہوئے مگر اس مجسمہ غزم و استقلال نے کہا کہ مجھے جانے دو، میں انجام سے باخبر ہوں۔ الغرض جناب عبد المطلب ابرہہ کے لشکر میں اس طرح وارد ہوئے جیسے کوہ سیاہ کے مقابل ماہ تاباں آجائے۔ یاشب تار پر نور سحر چھا جائے۔ مخالفین میں جس کی نظر پڑی وہ مبہوت و دم بخود رہ گیا۔ اتنا پوچھ سکے کہ نور مجسم تم کون ہو؟ عبد المطلب نے نام بتایا اور کہا کہ ابرہہ بن صباح تک جانا چاہتا ہوں، دربانوں نے ابرہہ کو مطلع کیا۔ ابرہہ نے بار بار بی کی اجازت دی اور فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ ہاتھیوں کی فوج بھی بلا کر دو روئے کھڑی کر دی گئی۔ یہ ہاتھی بھی مسلح تھے، سر پر آہنی توئے، سونڈ میں تلواریں لیے اپنے سواروں کے حکم کے منتظر کہ اشارہ پاتے ہی کپل ڈالیں۔ مگر ہاشم کا نور نظر جب آگے بڑھا تو فوجوں کی صفیں دیکھتی رہ گئیں۔ یہاں تک کہ جب آپ ہاتھیوں کے اس درہ کو عبور کر رہے تھے کہ انھیں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس وقت ابرہہ اور اس کے لشکر کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب ہاتھیوں کے اس جھومتے ہوئے پہاڑ نے عبد المطلب کے سامنے سر نیاز خم کر کے گھٹنے ٹیک دیے جس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلتا چاہیے تھا کہ خوف زدہ کرنے والے خود ہی خوفزدہ ہو گئے۔ اس سے بنی ہاشم کی جلالت اور دبدبہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے جو خلافت الہیہ کے منصب پر فائز نہیں ہوتے وہ بھی باطل کے مقابلے میں انتہائی وزنی ثابت ہوتے ہیں۔

ابرہہ نے بڑھ کر حضرت عبد المطلب کا استقبال کیا۔ اپنے پہلو میں بٹھا کر

کوشش کی اور ایک مخصوص قاصد عبد المطلبؑ کی خدمت میں بھیج کر یہ کہلایا کہ ہم اب واپس جانے کو تیار ہیں۔ اگر اہل مکہ حرجانہ ادا کر دیں اور ہماری اس عبادت گاہ کا تادان ادا کر دیں جو ان کی بدولت جل کر خاک ہو چکی ہے۔ جواب میں حضرت عبد المطلبؑ نے فرمایا کہ بے گناہ افراد خطا کار کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔ رہا حرم کا مسئلہ تو اس کے لیے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس کا ایک محافظ ہے وہ خود ہی اس کی حفاظت کرے گا تم اپنے سردار سے کہہ دو کہ وہ حملہ کرے یا واپس جائے۔ مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔

جناب عبد المطلبؑ کا جب یہ جواب استغنا پہنچا تو ابرہہ نے مایوس ہو کر کہا کہ اب مصالحت کی گنجائش نہیں ہے، حملہ کر دو۔ اس کے بعد وہ طوفانی فوج حرم کی طرف بڑھی۔ قہر الہی کو حرکت ہوئی اور اللہ کی ایک مخلوق نے (جو ابابیل کے نام سے موسوم ہے) آسمان سے چھوٹی چھوٹی کنکریاں برسا کر ابرہہ کے سارے لشکر کو آن واحد میں جگالی کیا ہوا بھوسہ بنا دیا۔ نہ ابرہہ بچا، نہ اس کی فوج، عبد المطلبؑ کو یقین محکم کے صلے میں اللہ نے فتح و ظفر سے ہمکنار کر دیا۔

اس واقعہ میں قہر الہی کی شانِ نزول بھی عجیب تھی۔ دستور قدیم کے مطابق نہ زمین شق ہوئی، نہ آگ برسی، نہ تیز و تند ہواؤں کا طوفان آیا، نہ انسانوں کو مسخ کیا گیا اور نہ تختہ پلٹا گیا۔ کیونکہ یہ وہ مقام تھا جو طوفانِ نوحؑ کے ہمہ گیر قہر کے موقع پر بھی عذاب کے پانی سے محفوظ رہا۔

چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعہ ننھی ننھی کنکریاں مرکزِ ظلم پر یوں برساتی گئیں کہ نہ حرم کو کوئی صدمہ پہنچا نہ سر زمین حرم کی بے حرمتی ہوئی، نہ کوئی بے قصور ہلاک ہوا اور نہ کوئی قصور وار بچ سکا۔

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے انکار ناممکن ہے۔ مولانا ندوی کا یہ کہنا کہ ابرہہ

عظمت زیر نقاب رہ جاتی۔ خلیل اللہ کی تعمیر اور ذبیح اللہ کی محنتیں دنیا کی دیگر تعمیرات کی ہم پلہ ہو کر رہ جاتیں اور اللہ کی قدرت و توانائی موضوع بحث بن جاتی۔ لہذا حضرت عبد المطلبؑ یہ کہہ کر واپس آگئے کہ خانہ کعبہ کے خلاف جو کچھ تمہارے دل میں ہے اسے کر کے اپنا انجام خود دیکھ لو۔

حضرت عبد المطلبؑ خود تو چلے آئے مگر دبدبہ ہاشمی کے غیر فانی نقوش قلب دشمن پر چھوڑ آئے، جس کے اثرات ابرہہ کے اس اعتراف کی شکل میں ظاہر ہوئے کہ جب اس نے کہا کہ اس شخص کی زبردست ہیبت میرے دل میں سما گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ہمراہیوں سے مشورہ لیا کہ تم لوگ بتاؤ کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ لوگوں نے تباہی و بربادی کا مشورہ دیا اور کہا کہ مکہ کو لوٹ لیں اور حرم کی ایک ایک اینٹ کھود کر جدہ کے سمندر میں پھینک دیں۔ چنانچہ ابرہہ مع لشکر اپنے تخریبی اقدام کو جامہ عمل پہنانے کی غرض سے چلا، ادھر حضرت عبد المطلبؑ نے مکہ خالی کر دیا اور کوہ ابوقیس پر اس لیے چلے گئے کہ مشیت الہی کو اپنا حکم نافذ کرنے میں تردد نہ ہو، جس طرح انبیائے سابقین نے الہی قہر و غضب کا نشانہ بننے والی بستیوں کو چھوڑا تھا اسی طرح آپ نے مکہ کو خالی کر دیا اللہ سے نصرت کا طلبگار ادھر پہاڑ پر پہنچا ادھر حیوانیت کے بل پر مقابلہ کرنے والی جماعت حرم کی طرف بڑھی، مرضی قدرت نے چاہا کہ ایک بار پھر غافلوں کو چونکا کر اتمامِ محبت کر لی جائے۔ چنانچہ حرم تک پہنچتے پہنچتے وہ کوہ پیکر باقی جو گویا لشکر کے علم کی جگہ تھا، یکبارگی رگ گیا۔ ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں لیکن وہ اس وقت تک آگے نہ بڑھا جب تک اس کا رخ خانہ کعبہ سے دوسری طرف موڑا نہیں گیا۔ لیکن اس کے باوجود دشمنوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ اپنے ارادے پر قائم رہے البتہ اس درمیان ابرہہ نے مصالحت کی ایک بار پھر ناکام

نے عبدالمطلبؑ کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد کی صریحاً توہین اور ہم اہل اسلام کے لیے انتہائی دل آزار، قابل عجز اور قابل مذمت جملہ ہے۔

حضرت ابوطالب علیہ السلام

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی جناب ابوطالبؑ کے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں :-

”ابوطالب نے اسلام قبول نہیں کیا“ (المرتضیٰ ص ۳۹ سطر ۶)

اس کے بعد ندوی صاحب نے محض اسی جملے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ حاشیہ پر اپنے نوٹ میں فرماتے ہیں کہ :-

”یہ بات کتب حدیث، سیرت قدیم و جدید سے ثابت اور مشہور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا، لیکن یہ بات اس کا بین ثبوت ہے کہ یہ دین اصول و عقیدہ کا مذہب ہے۔

نہ کسی فرد کی طرفدار کرتا ہے اور نہ کسی خاندان کی۔ بنیاد صرف وہ ہے جس کی دعوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ شخصی محبت اور تنہا مدافعت و حمایت بھی کام نہیں آتی اگر اس کے ساتھ صحیح عقیدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ایمان نہ ہو“

(المرتضیٰ ص ۳۹)

امتداد زمانہ کے زیر اثر مختلف ادوار میں بخاری کی ایک مرسل روایت کی بنا پر (جس میں مسیب شامل ہے) کچھ ایمان فروش حضرت ابوطالبؑ کے ایمان و اسلام پر اپنی گندی اور ناسور زدہ ذہنیت کا کیچڑ اچھالتے آئے ہیں جن کی

تقلید مولانا ندوی نے بھی المرتضیٰ میں کی ہے۔ حالانکہ اصول اور انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب تک کسی انسان کا کفر ثابت نہ ہو، اس وقت تک اس کے ایمان یا اسلام کو چیلنج کرنا محض جہالت اور بے وقوفی کی دلیل ہے۔

مولانا ندوی کی بات بھی دیگر معترضین کی سابقہ گفتگو کی طرح اس لیے بے وزن اور ناقابل التفات ہے کہ وہ حضرت ابوطالبؑ پر تاریخ اور دلائل کی روشنی میں کفر کا فتویٰ صادر فرمانے سے قاصر ہیں۔ لہذا صرف یہ کہہ دینا کہ ”ابوطالب نے اسلام قبول نہیں کیا“ یا ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا“ اور اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں کوئی کتابی حوالہ نہ پیش کرنا، حضرت ابوطالب کی بلند پایہ ذات و الاصفات کو سبک کر کے عالم اسلام کے سامنے پیش کرنے کی سعی ناکام کے مترادف ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ مولانا ندوی اس مہمل گفتگو کے جواب میں جناب ابوطالب کی حیات طاہرہ کے ان لمحات کی ایک جھلک ناظرین کی خدمت میں پیش کر دی جائے جو آپ کے ایمان و اسلام سے وابستہ ہیں۔ اس جھلک کی ابتدا میں اپنے ہی ایک شعر سے کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

سراپا وہ ایمان کامل تھا جس نے رسالت کو پالا امامت کو ڈھالا

نبی کے چچا کے مقابل وہ آئے جو اپنے کو کہتا ہو ایمان والا (مولف)

رسالت آج صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ حیات میں آٹھ گڑھیں پر چکی تھیں کہ مشیت الہی کو منظور ہوا کہ حضرت عبدالمطلب کو ان کے بار سے ہلکا کیا جائے اور جناب ابوطالب کو یہ خدمت سپرد کی جائے جس کی تمنا انھوں نے اس وقت ظاہر کی تھی جب عبد اللہ کی قربانی کا مسئلہ درپیش تھا۔ حضرت عبدالمطلب علیہ السلام جب علالت میں شدت ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ بیت المحرام کے نزدیک لے چلیں اور کعبہ کے پردوں سے متصل رکھ دیں۔ تعمیل کی گئی اور آپ کی اولادیں

فرائض کے احساس نے چچا کو رسول کے باپ کا درجہ دیا اور چچا فاطمہ بنت اسد نے ماں کی جگہ لی اور ایسی شفقت و محبت سے پیغمبر اسلام کی پرورش فرمائی کہ والدین کی کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔

حضرت ابوطالب کی شادی آپ کی حقیقی چچا زاد بہن فاطمہ بنت اسد سے ہوئی تھی جو ابتدائے عمر سے ہی ملت ابراہیمی اور دین فطرت پر گامزن تھیں لیکن ان تفصیلات کے ساتھ کہ جو حضور سرور کائنات اپنے ساتھ لائے تھے آپ نے سند بعثت میں جناب خدیجۃ الکبریٰ کے ہمراہ اسلام قبول فرمایا تھا اور آپ کا شمار اسلام قبول کرنے والی خواتین کی صف اول میں ہوتا ہے۔ مسئلہ میں آپ اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ اس طرح مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد مکمل دس سال تک حضرت ابوطالب کے ساتھ رہیں اور اس وقفہ میں دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چچی کو اختلاف عقائد کی بنیاد پر ابوطالب سے علاحدہ ہونے کا مشورہ دیا نہ کوئی خواہ مخواہ کیا جیسا کہ تفسیر کبیر، فخر الدین رازی جلد ۸ اور شرح بخاری قسطلانی ج ۳ ص ۳۴۹ سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت عمر کی زوجہ محترمہ ام کلثوم بنت عقبہ بن معیط کے پاس سے بھاگ کر آئیں اور انھوں نے اسلام قبول کیا تو ان کے رشتہ داروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن پیغمبر نے یہ کہہ کر ان کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی عورت کافر کی زوجیت میں نہیں رہ سکتی۔ لہذا اس ارشاد پیغمبر کی روشنی میں یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ فاطمہ بنت اسد کی طرح حضرت ابوطالب بھی راہ حق پر اپنی آخری سانس تک گامزن رہے اور اپنے ایمان و اسلام کی تابندگی کے ساتھ سند بعثت میں جو ارحمت سے ہمکنار ہو گئے اور آپ کے انتقال کے سال کو

آپ کے چاروں طرف بیٹھ گئیں۔ ان کے علاوہ روسائے قریش اور شیوخ قبائل بھی سب موجود تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہو۔ اس کرب و مضطرب کے ماحول میں حضرت عبدالمطلب نے کروٹ لی اور قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا تم سب پر میرا حق نہیں ہے؟ سب نے بیک آواز ہو کر کہا۔ ہم میں ہر خورد و کھال پر آپ کا حق ہے اور آپ ہمارے بہترین قائد ہیں۔ اس اقرار کے بعد حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کہ میں محمد بن عبد اللہ کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہوں اور اس امر کی تاکید کرتا ہوں کہ ان کی تعظیم و اکرام کرنا اور ان پر ظلم و جور نہ کرنا۔ اس کے بعد آپ نے جناب ابوطالب کی طرف کروٹ لی اور کچھ اشعار مرحمت فرمائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ ”ابوطالب میں تم کو وصیت کرتا ہوں اور اپنے قرۃ العین محمد کو تمہارے سپرد کرتا ہوں تم اس کا خیال رکھنا اور اپنی آخری سانس تک اس کی تعظیم و متابعت کرنا اور اس کے دشمنوں سے خبردار رہنا۔

اس نادر روزگار امانت کے لیے امانت دار کی تشخیص میں صرف صلیب و بطنی یگانگت کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ مشورۃ الہی کو بھی مقدم سمجھا گیا۔ چنانچہ زرقانی ثواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ”عبدالمطلب نے اولادوں کے درمیان قرعہ اندازی بھی کی اور قرعہ ابوطالب کے نام نکلا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ ایسے کو اپنی امانت سپرد کرے جو اس کا منکر اور اس کے قانون کا مخالف ہو؟“

ہاشم کے گھرانے کی یہ خصوصیت ہے کہ خلف کا طریق کار سلف کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہاں قول و فعل میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہوتا۔ برسوں باپ کا انداز تربیت قبول کرنے کے بعد یہ کیونکر ممکن تھا کہ جناب ابوطالب اپنے دور میں باپ کی تربیت کو فراموش کر دیتے۔ رسالت کے تحفظ کی ذمہ داری اور

شادی میں سامنے آئے ہیں۔

یہ حقیقت بھی ناقابل انکار اور آفتاب کی طرح روشن ہے کہ جب جناب خدیجہ نے پیغمبر اسلام سے شادی کی خواہش کی اور نسبت طے ہو گئی تو رسول اللہ صلعم کی جانب سے جو خطبہ نکاح جناب ابوطالب کی زبان مبارک پر جاری ہوا اس کی ابتدا ان لفظوں سے تھی: ”الحمد لله الذی جعلنا من ذریۃ ابراہیم“ تمام تعریفیں اس خدا کی ہیں جس نے ہمیں ذریت ابراہیم میں قرار دیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ شکر ہے اس پروردگار کا جس نے ہمیں فضیلت عطا کی۔ یہ میرا بھتیجا محمد میرے بھائی عبد اللہ کی یادگار اور فضل و ثروت میں لاتانی ہے۔ پچیس اونٹوں اور چار سو دینار سرخ پر عقد ہوا۔ مہر کی رقم حضرت ابوطالب نے اسی وقت ادا کر دی۔ (تاریخ اسلام ج ۲ ص ۸۷ تلخیص سیرۃ النبی ص ۹۹ الیعقوبی ج ۲ ص ۱۶ وغیرہ)

ڈپٹی نذیر احمد کا کہنا ہے کہ آپ عبد المطلب کی اولادوں میں سب سے زیادہ باوقار اور عقلمند تھے۔ عبد المطلب کے بعد آپ نے پیغمبر اسلام کی پرورش کی اور تاحیات ان کی نصرت و حمایت کرتے رہے۔ مولوی شبلی نعمانی کا کہنا ہے کہ ابوطالب کا طریقہ تازلیت رہا کہ آنحضرتؐ کو اپنے ساتھ سلاتے تھے اور جہاں جہاں جاتے ساتھ لے جاتے۔ کفار قریش اور اشراۃ یہود سے آپ نے آنحضرتؐ کی حفاظت کی، اور انھیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچے دیا۔ علامہ طریحی کا بحوالہ امام جعفر صادق علیہ السلام کہنا ہے کہ ابوطالب ایمان کے تحفظ میں اصحاب کعبہ کے مانند ہیں۔ شمس العلماء نذیر احمد فرماتے ہیں کہ ابوطالب دل سے پیغمبر کو اللہ کا رسول اور اسلام کو خدا کا سچا دین سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرتے وقت بھی جناب ابوطالب کلمہ پڑھ رہے تھے۔ (ماخوذ از چودہ سارے ص ۴۰-۴۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ”عام الحزن“ کے نام سے موسوم کر دیا حضرت ابوطالب نے اپنی حیات کے آخری دور میں کچھ اشعار کہے تھے جن میں یہ دو شعر قابل توجہ ہیں:

ودعوتی وعلت انک صادق ولقد صدقت فکنت قبل امینا
ولقد علمت بان دین محمد من خیر ادیان البریۃ دینا
ترجمہ: اے محمد تم نے مجھے اسلام کی طرف دعوت دی اور میں خوب جانتا ہوں کہ تم صادق اور سچے ہو اور تم اس عہدہ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے بھی لوگوں کی نظر میں صادق اور سچے تھے، میں خوب جانتا ہوں کہ تمہارا دین تمام ادیان عالم سے بہتر ہے۔

حضرت فاطمہ بنت اسد سے عقد کے موقع پر جناب ابوطالب نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ بھی آپ کے ایمان کا مظہر اور تاریخ کے خزانے میں گوہر نایاب کی طرح محفوظ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس خدا کے لیے تمام خوبیاں مخصوص ہیں جو رب العالمین اور کائنات کی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے اور جس نے ہم کو پیدا و سردار کی حیثیت سے منتخب کر کے عارفین و مخلصین میں شمار کیا۔ تمام عیوب سے پاک رکھا اور ہمیں تمام قبائل عرب پر فضیلت دے کر ان کا پیشرو بنایا ہم خلاصہ نسل ابراہیمی، جو ہر صفات خلیلی اور حضرت اسماعیل کی کشت بار آور ہیں۔ ہم نے فاطمہ بنت اسد سے شادی کی اور ان کا مہر شرعی ادا کر کے امر تزویج نافذ کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے متواتر سات دن تک دعوت ولیمہ کا اہتمام کر کے تمام قبائل عرب کی آنکھوں کو خیرہ بنا دیا۔ اس کا تذکرہ امیہ بن صلت نے اپنے اشعار میں کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوطالب نے اپنی شادی کے ولیمہ سے ہمیں ڈھانپ لیا ہے اور نہایت خلق و محبت کے مظاہرات اس

کفر و عناد کی باتیں تھیں ان کو اللہ نے محو کر دیا اور ایک مجسمہ صداقت در رسول اللہ (صلعم) کے خلاف جو زہر اگلا گیا تھا وہ نقش بر آب ہو کر رہ گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مخالفین کی تمام باتیں باطل ثابت ہوئیں۔

(۳) ایک موقع پر آپ نے حضور کو اپنے اشعار کے ذریعہ کار تبلیغ جاری رکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے بیٹا اپنا کام کرتے رہو اور نہایت اطمینان سے دعوت حق میں سرگرم رہو کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے کفار کہہ رہے تھے کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

(۴) ایک موقع پر آپ نے کچھ اشعار پڑھے، درمیان میں رسول کی طرف اشارہ کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ بے شک تم اللہ کے رسول ہو اور نورانی صورت والے بلند مرتبہ سردار ہو۔ تم بھی پاک و پاکیزہ ہو اور تمہارے ماں باپ بھی پاک اور عالی نسب ہیں۔

(۵) جب عثمان بن مظعون کو شاہراہ حق اختیار کرنے پر کفار نے اذیتیں دیں اور انھیں مضروب کیا تو آپ کے حق نواز جذبات براں گھٹنے ہوئے اور آپ نے اپنے اشعار میں فرمایا کہ کیا تم اس بے وفا زمانے کے نارد اسلوک پر گر کہ فتنہ خاطر ہو اور حزن و ملال کو دل میں جگہ دیتے ہو۔ یہ تو اس کی طینت ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ اس کے اخلاق کا تو یہ عالم ہے کہ وہ فواحش کو ہنر سمجھتا ہے اور حیلہ سازی کو کمال انسانیت جانتا ہے۔ خدا ظالموں کو ذلیل کرے۔

اگر میں زندہ رہ گیا تو بہت جلد اس کا انتقام لوں گا اور یہ پیمانہ اسی طرح لبریز ہو گا جیسے ان کا پیمانہ ظلم۔ میرے اقدامات اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک کفار اپنے کړتوت سے باز نہ آجائیں اور سرمدلت خم نہ کر دیں ان کے ظالمانہ اقداموں کا جواب دینے کے لیے میرے پاس صاعقہ باز تلوار موجود

حضرت ابوطالب علیہ السلام کا ادبی کمال بھی نقطہ سروج پر تھا جس کے ثبوت میں آپ کے اشعار موجود ہیں جن سے اسلام کی تبلیغ اور رسالت کی تائید کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے بھائی حمزہ کے مشرف بن اسلام ہونے کے موقع پر فرماتے ہیں کہ اے بھائی آپ اللہ کے دین اور محمد کی متابعت میں ثابت قدم رہیں اور استقلال کے ساتھ اظہار اسلام کرتے رہیں۔ خدا آپ کو عز و ثبات کی توفیق عطا کرے۔

اسی طرح حضرت ابوطالب کے وہ بے شمار اشعار جو مختلف مواقع پر آپ نے ارشاد فرمائے، اپنے دامن میں ایمان و اسلام کی دولت لیے آج بھی صفحہ قرطاس پر موجود ہیں۔ چونکہ یہ اشعار عربی زبان میں ہیں اس لیے طوالت کے خیال سے انھیں ترک کر کے ان کے مفہوم پر مبنی چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) جب کفار کہہ رہے تھے کہ آپ اپنے بھتیجے محمد کو اس بات سے روکیں کہ وہ ہمارے خداؤں اور ہمارے دین کو برا بھلا کہتے ہیں تو آپ نے رسول سے فرمایا کہ بیٹا تم تبلیغ حق کو جاری رکھو، بخدا جب تک میں زندہ ہوں کفار تم تک نہیں پہنچ سکتے اور جب تک میرے بازوؤں میں قوت ہے یہ لوگ تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔

(۲) جب کفار کے عہد نامہ کو دیمک و فتر بے معنی کی طرح چاٹ گئی تو حضرت ابوطالب نے قریش کو آگاہ کیا اور فرمایا کہ بس اس میں اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے منکرین کو یقین نہ آیا تو آپ نے ان کے ظلم و ضد کو اپنے اشعار میں نظم کیا جن میں سے بعض کا مفہوم یہ ہے کہ عہد نامہ کی سرگزشت مقام عبرت ہے۔ جب بے خبر کو اس کی خبر دی جاتی ہے تو وہ آئینہ حیرت ہو جاتا ہے۔ اس عہد نامہ میں جو

میں ذلیل لوگوں کے حلیف ہوئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں محمدؐ کا سچا جاں نثار ہوں اور انھیں اللہ کا سچا رسول مانتا ہوں۔ خدا نے ان کو دنیا کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔ کوئی ان کا مثل نہیں ہے۔ ان کا ولی ایسا معبود ہے جو ان سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں رہتا۔ وہ ایسا ممتاز ہے کہ ہر بلندی اس کے آگے لپٹ ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ہم نے اپنے سینوں کو سپر بنا لیا ہے۔ خدا اس کو اپنی حمایت و حفاظت میں رکھے اور اس کے نہ مٹنے والے دین کو دنیا پر غالب کر دے۔

(۷) مورخ ابوالقداس نے جناب ابوطالبؑ کی ایک مسلسل نظم کو جلد اول میں تحریر کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ نظم حضرت ابوطالبؑ کی طرف سے تصدیق رسالت پر کامل دلیل ہے۔ جس کے کچھ اشعار کا ترجمہ یوں ہے کہ:-
بخدا کفار قریش اپنی جماعت سمیت تم تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ میں زمین میں دفن نہ ہو جاؤں، اے محمدؐ! تم کو جو خدا کا حکم ہے اس کا بے خوف اعلان کرو۔ اے محمدؐ تم نے مجھ کو اللہ کی طرف دعوت دی ہے اور مجھے تمھاری صداقت و امانت کا محکم یقین ہے اور تمھارا دین تمام مذاہب عالم سے بہتر اور ان کے مقابلہ میں کامل تر ہے۔

(۸) حضرت ابوطالبؑ نے اپنے خاندانی وقار اور رفعت کا تذکرہ بھی اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔ سیرت ابن ہشام میں اس کے اشعار موجود ہیں۔ علامہ دجلانی نے اس نظم کو ابوطالبؑ کی شاعری کا شاہکار قرار دیا ہے۔ یہ نظم بھی تصدیق نبوت کی دلیل میں ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ اشراف قریش اگر کسی موقع پر فخر و مباہات سے بزم آرائی کریں تو عبد مناف ان میں جو برے عیب ثابت ہوں گے، اور جب عبد مناف کی نسل میں شرافت و نجابت کا چرچا

ہے جو دماغی امراض کو دور کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ میری طرف سے یہ شمشیر زنی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ بد دماغ لوگ اپنے دماغوں کی اصلاح نہ کریں گے یا اس کتاب خدا پر ایمان نہ لائیں گے جو رسول کے لیے ہے اور جس کی حقانیت و صداقت کے محکم شواہد موجود ہیں۔

(۹) جناب ابوطالبؑ علیہ السلام کا ایک لامیہ قصیدہ بہت مشہور ہے جو سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے ان میں سے بعض اشعار کا تذکرہ علامہ ابن ابی الحدید نے بھی شرح نہج البلاغہ میں کیا ہے اور علامہ دجلانی نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ ابوطالبؑ کے ایمان پر یقین کی واضح دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن کثیر نے اس کی تعریف میں کہا ہے کہ یہ قصیدہ بے حد بلیغ ہے اور کوئی اس کی مثال ممکن نہیں ہے۔ یہ قصیدہ تعلقات سب سے بہتر و بلند تر ہے۔ اس کے بعض اشعار کا مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

کفار مکہ کی دلی تمنا ہے کہ ہم ترک وطن کریں۔ اے کافرو! یہ آرزو بے بنیاد اور غلط ہے۔ حرم کی قسم ہم بغیر محمدؐ کی مرضی کے کبھی اس سرزمین سے جدا نہ ہوں گے۔ تم ہمیشہ یوں ہی جلتے اور کڑھتے رہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم محمدؐ کو بغیر مقابلہ کے تمھارے حوالے کر دیں گے۔ یاد رکھو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے بچے اور خواتین تک محمدؐ پر قربان ہو جائیں۔ سمجھ لو اگر تمھاری بیہوشی رہی تو تمھاری گردنیں چوں گی اور ہماری تلواریں۔ تم لوگوں کی حالت سخت قابل تعجب ہے کہ تم اس کے دامن کو چھوڑ رہے ہو جس کے ویلے سے بارش کی دعا کی جاتی ہے جو رحمت للعلین، حق کا طرفدار، یتیموں کا والی اور بیواؤں کا سرپرست ہے۔ وہ ہماری روح و جان ہے اور ہم وہ ہیں کہ کبھی کسی کا خون ہمارا ہم کو دینا نہیں پڑا اور نہ ہم نے کسی بے گناہ کو بے خطا کو قتل کیا۔ نہ ہم مصیبت

ہوں گا اور نہ میری نجیب الطرفین اولادیں اس کی نصرت سے دریغ کریں گی۔
اس نظم کو ابن ابی الحدید نے بھی شرح پنج البلاغہ کی تیسری جلد میں تحریر کیا ہے۔
(۱۱) حضرت ابوطالبؑ کی ایک نظم تنزیل وحی سے متعلق بھی ہے۔ اسے بھی
ابن ابی الحدید نے شرح پنج البلاغہ کی تیسری جلد میں تحریر کیا ہے۔ ابوطالب فرماتے
ہیں کہ محمدؐ وہ نبی ہیں جن پر رب العالمین کی جانب سے وحی نازل ہوتی ہے جو ان
کی رسالت کو تسلیم کرے گا اس کو حشر میں شرمندہ ہونے کی نوبت نہ آئے گی۔
محمدؐ خدا کی قسم محبوب خدا ہیں، امین شریعت ہیں، ہر نبوت من جانب اللہ ان
پر ثبت ہے۔ اس کے بعد آپ کفار قریش کو متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ
خبردار رسولؐ کے معاملہ میں احمق نہ بنو، اور منحوسوں، گمراہوں کا اتباع نہ کرو۔

(۱۲) حضرت ابوطالبؑ علیہ السلام کا ایک قصیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی ہے جو ابن ابی الحدید کی شرح پنج البلاغہ کی تیسری
جلد میں موجود ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا نے محمدؐ کو
مکرم بنایا اور اپنی تمام مخلوقات پر انھیں مشرف کیا، اے پروردگار! تو گواہ رہنا
کہ میں دین محمدؐ پر ہوں اور ہدایت یافتہ ہوں۔ جس کو گمراہی پسند ہو وہ گمراہ ہے۔
ان نظموں کے علاوہ حضرت ابوطالبؑ کے اور بھی اشعار ہیں جو ایسے ہی
پاکیزہ مقاصد اور بلند تر تعلیم پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ
حضرت ابوطالبؑ کے ایمان و اسلام پر بھرپور تبصرہ کیا جائے۔ اس امر کے لیے
الگ سے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ بہر حال مذکورہ قصائد پر اگر تنقیدی نگاہ ڈالی
جائے تو حضرت ابوطالبؑ کا اسلامی کردار اور عقیدہ آفتاب کی طرح روشن و منور
نظر آتا ہے اور ہر انصاف پسند انسان ابوطالبؑ کے ان اشعار کی روشنی میں
آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ آپ صرف مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ آپ نے بعض مواقع

ہو گا تو ہاشم اور بنی ہاشم کو فضیلت حاصل رہے گی اور بنی ہاشم اگر فخر و ناز کریں
تو محمد مصطفیٰ کی ذات اقدس محض شرف ثابت ہوگی اور یہ وہ ہیں جنہیں اللہ
نے نبوت عطا کی ہے۔

(۹) حضرت ابوطالبؑ نے ابولہب کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کے سلسلے میں اپنی ایک نظم میں ہدایت فرماتے ہوئے کہا کہ اے
ابولہب! ایسا کام نہ کرو کہ جس سے زندگی بھر تمہیں عرب کے میلوں اور محفلوں میں
گالیوں سے نوازا جائے۔ رسول کی مدد و نصرت میں زندگی گزارو کیونکہ تم بے
دست و پا اور عاجز و مجبور نہیں پیدا کیے گئے۔ اس نظم کو بھی ابن ہشام نے
اپنی سیرت میں درج کیا ہے۔

(۱۰) ابن ہشام کی سیرت میں حضرت ابوطالبؑ کی ایک نمایاں اور معرکہ الارا
نظم اور بھی ملتی ہے جو حضرت علیؑ علیہ السلام اور حضرت جعفر طیارؑ سے متعلق ہے
اس نظم میں بھی آپ نے ترغیب نصرت کا نشان بلند کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ
ایک مرتبہ جناب ابوطالبؑ نے رسول اللہ کو دیر تک نہ دیکھا تو بے چین ہوئے
اور آپ کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں کفار نے گرفتار نہ کر لیا ہو۔ آپ
فوراً اپنے فرزند جعفرؑ کو لے کر تلاش میں نکلے دیکھا کہ مکہ کی ایک گھاٹی میں رسولؐ
اور علیؑ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوطالبؑ نے جعفرؑ سے کہا کہ آگے بڑھو اور
اپنے بھائی کے ساتھ بازو جوڑ کر اس کا ساتھ دو۔ جناب جعفر طیارؑ نے حکم کی تعمیل
کی اور مصروف نماز ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر فرط مسرت سے ابوطالبؑ کی آنکھیں
چھلک پڑیں اور آپ نے کچھ اشعار فرمائے جن کا مفہوم یہ ہے کہ اے علیؑ و جعفرؑ
دیکھو تم لوگ کبھی دین حق سے دست بردار نہ ہونا اور اپنے بھائی محمدؐ کو کبھی
تنہا نہ چھوڑنا۔ میں محمدؐ کے دین کی تائید کرتا ہوں، بخدا میں اس سے دستبردار

افسوس ہے کہ عام کتابوں میں جناب طالب کے حالات نہیں ملتے۔ علامہ ابن قتیبہ دینوری نے لکھا ہے کہ جناب ابوطالب کے چار بیٹے ہوئے۔ طالب، عقیل، جعفر اور حضرت علیؑ۔ اور ہر بھائی دوسرے سے دس برس چھوٹا تھا۔ ان سب نے اولادیں چھوڑیں سوائے طالب کے کہ انھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ (معارف ص ۳۹) اور عمدۃ المطالب ص ۱۵ میں ہے کہ جناب ابوطالب کے چار بیٹے ہوئے اور ہر بھائی دوسرے بھائی سے دس سال چھوٹا تھا گویا جناب طالب جناب امیر سے تیس سال بڑے تھے۔ انھیں کی وجہ سے آپ کے باپ کی کنیت ابوطالب تھی۔ اور ان چاروں فرزندوں کی مادر گرامی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ یہ پہلی ہاشمی خاتون تھیں جن کے بطن سے ہاشمی فرزند پیدا ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ کی ہجرت کے بعد جناب طالب کا قیام مکہ ہی میں رہا یہاں تک کہ جب غزوہ بدر واقع ہوا تو کفار قریش نے انھیں بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ روانہ ہوئے مگر راستہ ہی سے غائب ہو گئے۔ کیونکہ وہ اسلام کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کو تیار نہیں تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے سمندر کی طرف چلے گئے اور پھر پلٹ کر نہ آئے۔ بعض مورخین کی تحریروں سے اس امر کی نشان دہی بھی ہوتی ہے کہ اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ نہ ہونے کی پاداش میں کفار مکہ نے انھیں سمندر میں غرق کر کے ختم کر دیا۔

علامہ دیار بکری نے لکھا ہے کہ طالب غزوہ بدر میں کام آئے جب مکہ کے مشرکین نے آپ پر ظلم و جبر اور تشدد کر کے آپ کو جنگ میں شامل کیا۔

(تاریخ خفیس ج ۱ ص ۱۸۴)

علامہ مسعودی نے تحریر کیا ہے کہ کفار قریش نے طالب بن ابوطالب کو

پر کار رسالت اور کار تبلیغ کے سلسلے میں پیغمبر اسلام کو حوصلہ دے کر نبوت کی رہبری بھی فرمائی ہے۔ میرے نزدیک مولانا ندوی کا یہ دعویٰ کہ ابوطالب نے اسلام قبول نہیں کیا بالکل غلط ہے بنیاد اور باطل ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ندوی صاحب حضرت ابوطالب کے ایمان و اسلام کے پرکھنے کی کوشش کے بجائے خود اپنے ایمان و اسلام کا محاسبہ کرتے کہ وہ کیا ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بخاری میں یہ روایت کیوں پیش کی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ خلفائے ثلاثہ کے والدین کا فرقہ اس لیے حضرت علی علیہ السلام کی عداوت میں ان کے والد بزرگوار کی فضیلت پر بھی ضرب لگائی گئی۔ ورنہ حقیقت سے اس روایت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مومن قریش حضرت ابوطالب اور جناب خدیجہ الکبریٰ کی قبریں مکہ کے قبرستان جحون میں ایک پہاڑی پر واقع ہیں۔ ان قبروں پر پہلے کوئی گنبد نہیں تھا۔ مورخ ذاکر حسین کا کہنا ہے کہ مرزا اصغر علی فصیح لکھنوی نے تیرھویں صدی کے وسط میں مومنین کی مدد سے ان پر گنبد تیار کرایا تھا۔

جناب طالبؑ

جناب ابوطالب کے سب سے بڑے صاحبزادے اور مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے حقیقی بھائی کا نام طالب ہے جو امیر المومنین سے تیس سال عمر میں بڑے تھے، انھیں کے نام سے حضرت ابوطالب کی کنیت وابستہ ہے۔ جناب طالب کے متعلق مولانا ندوی فرماتے ہیں:-

”طالب کی غزوہ بدر کے بعد حالت شرک میں موت واقع ہوئی“

(المرقئی ص ۴۰)

کہ کہاں ہوئی تھی۔ شیعوں کی بڑی جماعت کو یقین ہے کہ ان کی پیدائش اندرون کعبہ ہوئی۔ محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے ان کا خیال ہے کہ کعبہ میں جو صاحب پیدا ہوئے تھے وہ حکیم بن حزام بن خویلد بن اسد بن عبد العزی بن قصى ہیں۔“

(المقتضی ص ۴۸-۴۹)

ہوئی جو کعبہ میں جس کی ولادت جسے حق نے آغوش رحمت میں پالا اسی فخر کعبہ سے یہ چشم پوشی اسی کی فضیلت میں گر بڑ گھٹالا (مولف) خانہ کعبہ میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت ایسا مشرف ہے جو انبیاء و مرسلین کو بھی نصیب نہ ہوا۔ لیکن المقتضی کے مولف مولانا ندوی نے معاویہ کی ”حدیث مینو فکچرنگ کمپنی لمیٹڈ“ کی وضع کردہ ایک ناقص اور موضوع حدیث کی تلوار سے اس عظیم مشرف اور فضیلت پر وہابیت کی ضرب لگا کر ایک درختاں حقیقت کو افسانہ بنانے کی جو مذموم سعی فرمائی ہے وہ ہمارے لیے دل آزار اور کرب و اضطراب کا باعث ضرور ہے مگر ہمیں موصوف کی اس حرکت پر حیرت و استعجاب اس لیے نہیں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ علی کو وہ دوست نہیں رکھ سکتا جو حرامی ہوگا اور علی کو وہ شخص کبھی دشمن نہیں رکھ سکتا جو حلالی ہوگا۔ (اس حدیث کے راوی حضرت ابو بکر ہیں اور یہ حدیث ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۸۹ پر درج ہے)

مولود کعبہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت کی وضاحت سے پہلے یہ صراحت ضروری ہے کہ اس امر کا اجمالی جائزہ لیا جائے کہ خانہ کعبہ (جو امیر المومنین کی جائے ولادت ہے) کی عظمت کیا ہے؟

اس ذیل میں قرآن مجید کے سورہ آل عمران پک آیت ۹۶-۹۷ میں ارشاد

غزوہ بدر میں مجبور کر کے لڑنے کو بھیجا۔ چنانچہ وہ گئے مگر پھر ان کی کوئی خبر نہیں ملی البتہ ان کا یہ کلام اب تک محفوظ ہے۔

یا رب اما خرجوا بطالب فی مقنب من تلک المقانب
فاجعلهم المغلوب غیر الغالب والرجل المسلوب غیر السالب
اے پروردگار اگر یہ لوگ طالب کو زبردستی اپنی فوج کے ساتھ لے جاتے ہیں تو ان کو شکست دے اور انھیں اس درجہ کمزور کر دے کہ یہ خوب لوٹے جائیں اور یہ خود کسی کو لوٹ نہ سکیں۔ (مروج الذهب بر حاشیہ کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۷۴)

جناب طالب کی یہ دعا قبول ہوئی اور غزوہ بدر میں کفار کو شکست ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب طالب بھی دل سے ایمان رکھتے تھے لیکن کفار قریش کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ اسی کا نام تقیہ ہے۔

مولود کعبہ حضرت علی علیہ السلام

اس ذیل میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں:-

”صحیح روایتوں کے بموجب سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ بعثت نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ آپ کی پیدائش عام الفیل کے سنہ میں (چھٹی صدی عیسوی) رجب کی بارہ راتوں کے گزرنے کے بعد ہوئی۔ حاکم نے حکیم ابن حزام کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ تو اتر سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے بطن سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے اور حکیم ابن حزام بھی کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے:- سیدنا علی علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے

مقدس گھر میں خود ساختہ بتوں کی موجودگی کے باوجود نہ اس کی عظمت متاثر ہو سکی نہ اس کے شرف پر آنچ آ سکی۔ اس کے علاوہ خانہ کعبہ سے اخراج احصانم کے قبل، تحویل قبلہ، وجوب حج، طواف کے احکام اور ابرہہ کے لشکر سے اللہ کا خانہ کعبہ کو بچانا اس کی عظمت، فضیلت اور تقدس کی ناقابل تردید دلیل ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام چونکہ فخر کعبہ تھے۔ اسی لیے اللہ نے اپنے اس محبوب بندہ کی ولادت کے لیے اپنے ہی گھر کا انتخاب کیا جو تمام عالم میں مقدس اور مشرف گھر ہے۔

مولانا ندوی نے مروج الذہب (مسعودی) اور سیرت حلبیہ (ابن ابی الحداد) کا حوالہ دے کر جناب خدیجۃ الکبریٰ کے بھتیجے حکیم بن حزام کی ولادت کو اندرون کعبہ بتانے کی جو ناکام کوشش کی ہے اس سے آپ کی علمی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ اس روایت کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

”حکیم بن حزام کی ماں چند زنان قریش کے ساتھ کعبہ میں داخل ہوئیں حالانکہ وہ حمل سے تھیں، پس انھیں اچانک درد زہ لاحق ہوا اور فرش لاکر بچھایا گیا جس پر حکیم بن حزام پیدا ہوا“ (الاستیعاب فی فضائل الامصا ص ۱۲۲)

تمام اصولوں سے ہٹ کر اگر اس روایت کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تو کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حکیم بن حزام کی ماں خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے درد زہ میں مبتلا تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ خانہ کعبہ میں داخل ہونے کے بعد درد زہ میں شدت پیدا ہوئی اور اس وقت اس کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کرنا دشوار تھا۔ اس لیے حکیم بن حزام کی ولادت خانہ کعبہ میں ہو گئی۔ لیکن مذکورہ روایت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم بن حزام کی ماں جب کعبہ میں داخل ہوئی تو اس وقت وہ درد زہ میں مبتلا نہیں تھیں۔ بلکہ کعبہ میں داخل ہونے کے بعد درد شروع ہوا۔ ہر انسان یہ جانتا

ہوتا ہے کہ ”لوگوں کی عبادت کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ یقیناً یہی کعبہ ہے جو مکہ میں بڑی (خیر) برکت والا اور تمام عالم کا رہنما ہے اور اس میں (حرمت کی) بہت سی واضح اور روشن نشانیاں ہیں (منجملہ اس کے) مقام ابراہیم اور جہاں آپ کے قدموں کا نشان پتھر پر ہے اور جو اس گھر میں داخل ہوا وہ امن (کے حصار) میں آگیا۔ اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض اللہ کے لیے خانہ کعبہ کا حج بجالائیں جنھیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت (قدرت) ہو اور جس نے قدرت رکھتے ہوئے انکار کیا تو وہ یاد رکھے اللہ سارے جہاں سے بے پروا ہے“

مذکورہ آیت کے ذیل میں علامہ بیضاوی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں ”یہ سب سے پہلا گھر ہے جس کو حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا تھا، لیکن طوفان نوح میں وہ بے نشان ہو گیا۔ پھر حضرت آدمؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اس کی از سر نو تعمیر کی بعض کا کہنا ہے کہ اس جگہ پر تخلیق آدمؑ سے پہلے ایک گھر تھا، جس کا نام ”ضراح“ تھا اور ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے۔ جب آدمؑ زمین پر اتارے گئے تو انھیں حکم ہوا کہ وہ اس گھر کا حج کریں اور اس کے گرد طواف کریں، طوفان نوح میں یہ گھر فلک چہارم پر اٹھایا گیا تاکہ ملائکہ اس کا طواف کرتے رہیں“ (تفسیر بیضاوی ص ۱۸)

علامہ قطب الدین حنفی فرماتے ہیں کہ ”حضرت آدمؑ کی خلقت سے قبل خانہ کعبہ کی جگہ ایک گھر تھا جس کا نام ”ضراح“ تھا، ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے، پہلی بار ملائکہ مقررین نے اس گھر کی تعمیر کی، دوسری بار حضرت ابراہیمؑ نے اسے بنایا۔ (علام بیت الحرام ص ۱۳ مطبوعہ مصر)

معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ کی امتیازی خصوصیت شرف اور فضیلت یہ ہے کہ اس کی تعمیر عصمت (ملائکہ اور انبیاء) کے ہاتھوں عمل میں آئی اور فلک چہارم پر یہ ملائکہ کی عبادتوں کا مرکز بنا رہا۔ یہی وجہ ہے کافروں کے غاصبانہ قبضہ یا اس

ہے کہ درد زہ شروع ہونے کے کئی گھنٹوں کے بعد زچگی ہوتی ہے۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ درد زہ شروع ہوتے ہی پہلی منزل میں بچہ پیدا ہو گیا ہو، اور حاملہ عورت کو اتنا موقع نہ ملا ہو کہ وہ کسی دائی یا اسپتال کی طرف رجوع ہو سکے۔ حکیم بن حزام کی ولادت کا واقعہ ایسا انوکھا اور عجیب و غریب ہے جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ مشاہدات و تجربات کی روشنی اس واقعہ کی صحت کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

مذکورہ روایت کے ذیل میں ابن جوزی کا کہنا ہے کہ اس روایت کو حافظ ابو نعیم نے بیان کیا ہے، اور اس کی فضیلت میں ایک طولانی حدیث نقل کی ہے۔ لیکن انھوں نے سند میں روح بن صلاح کا نام لیا ہے جس کو ابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے اس لیے ہم اس روایت کا تذکرہ نہیں کرتے۔ (تذکرہ خواص الامم فی فضائل ائمہ)

ابن جوزی کے اس بیان کی تصدیق فصول المہمہ ص ۴۴ مطبوعہ ایران، روضۃ الشہداء ص ۱۳۴ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۳۸۷ھ اور ازالۃ الخفا وغیرہ سے ہوتی ہے۔

ابن عوف غطفویہ جن کا شمار اہل سنت کے بڑے محدثین میں ہوتا ہے اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ”ہزاروں کی تعداد میں موضوع حدیثیں بنی امیہ کے دور میں خلفائے ثلاثہ کے فضائل میں وضع کی گئیں اور کھل کر علی کے فضائل پر ضرب لگائی گئی۔ بنی امیہ ان حدیثوں کے تحت خلفائے ثلاثہ کے ہمراہ خود بھی رسول اللہ اور ان کے خاندان سے نزدیکی اور تقرب پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ اپنی جگہ یہ بھی گمان کرتے تھے کہ ان حدیثوں اور روایتوں کی بنا پر بنی ہاشم کی ناک مروڑ رہے ہیں“ (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغۃ الجزء الثالث ص ۱۵-۱۶)

میں اپنی ”اہم گفتگو“ میں اس امر کی وضاحت کر چکا ہوں کہ معاویہ نے عثمان کی شان میں جھوٹی حدیثیں اور غلط روایتیں اپنے کارخانہ حدیث سازی میں تیار کرانے کے بعد اپنے حاکموں اور گورنروں کو یہ فرمان جاری کیا تھا کہ عثمان کی شان میں حدیثوں اور روایتوں کا کافی سرمایہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ لہذا اب سلسلے کو بند کر کے شیخین (حضرت ابو بکر و عمر) کے لیے بالکل دوسری حدیثیں اور روایتیں بیان کی جائیں جیسی کہ علی کی شان میں موجود ہیں کیونکہ یہ طریقہ میرے لیے پسندیدہ اور باعث مسرت و شادمانی ہے۔ لہذا ان حالات میں معاویہ کے خود ساختہ اور دروغ گورادیوں کی طرف سے حکیم بن حزام کا خانہ کعبہ میں زبردستی پیدا ہو جانا یا پیدا کر دیا جانا حیرت انگیز و تعجب خیز ہرگز نہیں ہے۔

ابو عثمان جاحظ (جو حضرت علی اور ان کے شیعوں کا بدترین دشمن تھا) نے اپنی کتاب ”عثمانیہ“ میں حضرت علی کے فضائل کو اخفا کر کے ان کے مقابلہ میں خلفائے ثلاثہ و دیگر اصحاب کی شان بڑھانے کے لیے بہت سی جھوٹی حدیثیں اور غلط روایتیں نقل کی ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ دیگر فضیلتوں کے ساتھ خانہ کعبہ میں علی کی ولادت کی انفرادیت، ان کے شرف، فضیلت اور عظمت کو اس روایت کے ذریعہ سبک کیا جائے۔ لیکن جسے اللہ فضیلت اور بزرگی عطا کرتا ہے اس کی عظمتوں کو نہ کوئی چھین سکتا ہے اور نہ انوار الہی کو مادی طاقتیں چھپا سکتی ہیں۔

حالانکہ معاویہ کا کارخانہ حدیث سازی بنی عباس کے دور میں بھی اپنا کام کرتا رہا اور پیغمبر اسلام کے بعد مختلف طریقوں سے علی اور اولاد علی پر مظالم کا سلسلہ روا رکھا گیا۔ یوں ہی زمانہ گذرتا رہا، چودہ صدیاں بیت گئیں لیکن علی اور اہل بیت اطہار کے انوار فضیلت کو باطل کی سیاہی معدوم نہ کر سکی، ارباب اقتدار نے جس شد و مد کے ساتھ آل رسول کے فضائل کو اخفا کرنے کی کوشش

اٹھائیس برس کی تھی۔ (مطالب السؤل فی مناقب آل رسول ص ۴، مطبع جعفری کھڑی ۱۳۰۲ھ)
(۴) احمد بن منصور گادردنی (المتوفی ۵۵۵ھ) فرماتے ہیں۔ ان کی بائفاطمہ بنت اسد تھیں۔ وہ پہلی ہاشمیہ ہیں جن سے ہاشمی ہی اولاد پیدا ہوئی۔ اور علی فاطمہ کے بطن سے کعبہ میں پیدا ہوئے۔

(۵) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (المتوفی ۸۴۶ھ) تحریر فرماتے ہیں۔ "روایت کی گئی ہے کہ قبل ازیں کعبہ میں دو سانپ رہا کرتے تھے، جن کو معیار الولد کہتے تھے۔ اس لیے کہ جو بچہ مکہ میں پیدا ہوتا تھا تیسرے دن خانہ کعبہ میں لایا جاتا تھا اور رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ سانپ کہ جس کا نام حکم (کسوٹی) تھا دیوار سے ظاہر ہوتا اور بچہ کو سونگھتا تھا۔ اگر بچہ حلالی ہوتا تو چلا جاتا تھا اور اگر حرامی ہوتا تو وہ پھنکار مارتا کہ جس سے وہ بچہ غش کھا جاتا۔ جب شاہ ولایت حضرت علی کریم اللہ وجہہ اندرون کعبہ پیدا ہوئے تو روایت ہے کہ دونوں سانپ خودار ہوئے اور سونگھنا چاہتے تھے کہ شاہ ولایت نے دونوں کو چیر ڈالا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مکہ والوں میں غلغلہ ہوا کہ کسوٹی کو فنا کر دیا، سب رونے لگے۔ سرور کائنات صلعم نے فرمایا کہ رنجیدہ نہ ہو۔ اللہ نے تمام عالم کے لیے علی کو کسوٹی قرار دیا ہے۔ ایک جگہ دو کسوٹیاں نہیں رہ سکتیں جو شخص علی اور ان کے بچوں کو دوست رکھے گا وہ حلال زادہ ہے اور جو دشمن رکھے گا وہ حرام زادہ ہوگا۔"

(ہدایۃ السعداء)

(۶) شیخ الامام نور الدین علی بن احمد المعروف بہ صباغ مالکی کی (المتوفی ۵۵۵ھ) رقم طراز ہیں۔ ولادت علی مکہ مشرف میں اندرون کعبہ ۱۳ رجب کو جو خدا کا مہینہ ہے اور جس میں کشت و خون حرام ہونے کی وجہ سے آلات حرب کی جھنکار کبھی سنائی نہیں دی اور جو سلسلہ میں فرد ہے سترہ عام الفیل میں ہجرت سے ۲۳ یا ۲۵ سال

کی اسی قدر معجزانہ طور پر ان کے فضائل دشمنان اہل بیت ہی کے قلم سے اجاگر ہوتے گئے۔ حیرت ہے کہ ظالم و جاہر حکمرانوں اور آل رسول کے سخت ترین دشمنوں کی نظروں سے فضائل آل محمد کیوں کر پوشیدہ رہے اور ان علماء کے خلاف تادیبی کارروائی کیوں نہیں کی گئی جنہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی آل رسول کے فضائل کو اپنی کتابوں میں بیان کر کے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ یقیناً یہ معجزہ ہی ہے جو آل محمد کی فضیلتیں کتابوں میں محفوظ ہیں اور امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنی تابندہ و درخشندہ شخصیت کے ساتھ آج بھی آسمان فضیلت پر آفتاب کی طرح جلوہ گر ہیں۔

خانہ کعبہ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت کی تصدیق جن علمائے اہل سنت نے کی ہے ان کی عربی عبارتوں کو اختصار کی بنا پر نظر انداز کر کے صرف اردو ترجمہ نقل کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ابن جوزی (المتوفی ۷۵۲ھ) تذکرہ خواص الامہ میں رقم طراز ہیں۔ "روایت ہے کہ فاطمہ بنت اسد، طواف خانہ کعبہ میں مشغول تھیں اور انھیں دردزدہ لاحق تھا، جس کے لیے آپ مصروف دعا تھیں کہ خانہ کعبہ میں ایک در بنا اور وہ اندر داخل ہوتیں اور بچہ کعبہ کے اندر پیدا ہوا۔"

(۲) ابوالحسن علی بن حسین بن علی مسعودی (المتوفی ۳۲۶ھ) اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ علی ابن ابی طالب سے اس روز بیعت کی گئی جس دن عثمان بن عفان قتل ہوئے اور جائے ولادت ان حضرت کی خانہ کعبہ ہے۔

(۳) کمال الدین، ابوسالم قاضی محمد بن طلحہ شافعی (المتوفی ۶۵۲ھ) فرماتے ہیں۔ آپ کعبہ میں خاص بیت المحرام کے اندر پیدا ہوئے اور آپ کی ولادت پیغمبر کی خدیجہ سے شادی کے تین برس بعد ہوئی اور رسول اللہ کی عمر اس دن

جب ابوطالب آئے تو انھوں نے علیؑ نام رکھا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدیق نام رکھا جیسا کہ ریاض النضرہ میں ہے اور کنیت ابوالمحاسنین، امین شریف، ہادی، مہدی، ذوالاذن، الواعیہ اور یعسوب الامۃ وغیرہ رکھی اور اولیو کا بیان ہے کہ ولادت ان حضرت کی اندرون کعبہ ہوئی۔ (مدارج النبوة)

(۱۰) فاضل سعید گجراتی، شیخ قطب الدین حنفی کی مشہور کتاب، کتاب الاعلام یا اعلام مسجد الحرام کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں: مولد علی کرم اللہ وجہہ خود کعبہ کے اندر ہے جیسا کہ ثقات کی روایتیں بتاتی ہیں۔ لیکن قول مصنف ہے کہ مکہ میں مبارک جگہیں، مقامات پیدائش اور مشہور مسجدیں ہیں۔ منجملہ اس مقام پیدائش کے کہ جو حضرت علی ابن ابی طالب ہے اور جو مولد نبی سے قریب ہے اور کوہ ابو قیس کے نزدیک اس کی پشت پر واقع ہے جسے شعب علی کہتے ہیں وہاں ایک مسجد ہے جس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عظیم بہتان ہے، ایسے اقوال اہل بیت نبوت سے تعصب رکھنے والوں نے گڑھ لیے ہیں۔ (حاشیہ کتاب الاعلام)

(۱۱) محمد بن معتمد خاں بدخشاں کا کہنا ہے کہ ”حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولادت بروز جمعہ ۱۳ رجب سنہ عام الفیل میں بمقام مکہ واقع ہوئی اور روایت ہے کہ وہ جناب خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے اور حجرہ کعبہ میں نہ ان سے پہلے کوئی پیدا ہوا نہ بعد میں۔ یہ وہ فضیلت ہے جس سے خدا نے انھیں مخصوص کیا تھا۔

(نزول الایران)

(۱۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ: اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ امیر المومنین علی فاطمہ بنت اسد کے بطن سے کعبہ کے اندر ۱۳ رجب بروز جمعہ سنہ عام الفیل میں پیدا ہوئے اور کعبہ میں ان کے سوا کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا، نہ ان سے پہلے نہ بعد۔ (ازالۃ الخفاء)

پہلے اور بعثت سے دس بارہ سال پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کے سوا خانہ کعبہ میں کبھی کوئی شخص پیدا نہیں ہوا۔ یہ وہ فضیلت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان جناب کو اس سے اجلال منزلت اور اعلیٰ مرتبت اور اظہار کرامت میں مخصوص کیا ہے۔ (فصول المہمہ مطبوعہ ایران ص ۴۱)

(۷) ملا حسین کاشفی (المتوفی ۹۱۵ھ) تحریر فرماتے ہیں۔ کتاب بشارت مصطفیٰ میں یزید بن قنعب سے منقول ہے کہ میں عباس بن عبد المطلب اور اولاد عمری کے ایک گروہ کے ساتھ روبروئے بیت الحرام بیٹھا تھا کہ فاطمہ بنت اسد مسجد کے قریب تشریف لائیں، وہ مضطرب و بے چین تھیں، درود نہ اور وضع حمل کی علامتیں نمایاں تھیں۔ انھوں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اور بارگاہِ صمدیت میں عرض کیا کہ اے گھر کے مالک، تجھے اس کے بنانے والے کی بزرگی کا واسطہ، اس سختی کو مجھ پر آسان کر۔ راوی کہتا ہے کہ فوراً دیوار شق ہوئی اور فاطمہ اندر چلی گئیں اور ہماری آنکھوں سے غائب ہو گئیں اور ہم نے چاہا کہ کعبہ میں ہم بھی داخل ہو جائیں تو کسی طرح اندر نہ پہنچ سکے۔ چوتھے دن نکلیں تو علیؑ کو ہاتھوں پر لیے ہوئے تھیں۔ امام داؤد کہتے ہیں کہ علیؑ سے پہلے نہ ان کے بعد کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ وہ کعبہ میں پیدا ہوا ہو۔ (دروضۃ الشہداء ص ۱۳۲ سنہ ۱۸۷۳ھ)

(۸) علامہ نور الدین علی بن برہان حلی شافعی (المتوفی ۷۴۴ھ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے اور آپ پیغمبر سے تیس برس چھوٹے تھے۔

(انسان العیون فی سیرت الامین المامون ملقب بہ سیرت جزیرہ ص ۱۱۷ سنہ ۱۲۸۰ھ)

(۹) شیخ عبدالحق محدث بن سیف الدین محدث دہلوی بخاری (المتوفی ۷۵۵ھ) فرماتے ہیں۔ ”علی بن ابی طالب کا نام ان کی ماں فاطمہ بنت اسد نے حیدر رکھا اور

مستحسن ہے نہ قابل ستائش۔ بلکہ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو دو ہا بیت کی عینک سے آل محمد کی منقصدت میں باطل روایتوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مولانا موصوف غالباً حضرت شمس تبریز، مولانا جلال الدین رومی، عبد الرحمن نور الدین جامی، شیخ مصباح الدین سعدی، بوعلی قلندر، حضرت نظام الدین اولیاء، خواجہ فرید الدین عطار، شاہ نعمت اللہ دہلوی، شاہ نیاز بریلوی، امیر خسرو، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری وغیرہ سے واقف اور متعارف ہوں گے۔ ان صوفیائے کرام کا تصور حضرت علی ابن ابی طالب کے بارے میں کیا تھا؟ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں تاکہ کسی اعتراض کی گنجائش نہ رہ جائے۔

جامی فرماتے ہیں:-

تو سلطان صاحب سر پر آمدی
بہر صورت دل پذیر آمدی
علی نام کہ دی بہ ملک عرب
نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں:-

بہ زہد و عصمت و دانش مثال انبیاء باشد
چنین رفعت کہ می بینی بجز حیدر کجا باشد
امامت را کہ شاید کہ شاہ اولیاء باشد
امام حق کے باشد کہ باشد ہمسر احمد
بوعلی قلندر فرماتے ہیں:-

اعلیٰ قصر شان تو، روح القدس دربان تو
نور شمع حق زیب سپہر نہیب طسبق
تارفتہ تا ایوان تو خہباز فک انبیاء
گیرد ملک از تو سبق لے پیشوائے اولیاء
حضرت احمد جامع المعروف بہ زندہ پیل فرماتے ہیں:-

گر نجات آں جہاں مطلوب داری لے عزیز
امام شافعی نے یہاں تک کہہ دیا:-

(۱۳) مولوی صدر الدین احمد بردوانی تحریر فرماتے ہیں:- "ولادت ان حضرت کی خانہ کعبہ میں جمعہ کے دن ۱۳ رجب سنہ ۱۰۰۰ء میں واقع ہوئی۔"

(ردائع المصطفیٰ ص ۱۰ مطبوعہ مطبع احمدی کانپور سنہ ۱۳۳۵ھ)
(۱۴) شاہ محمد حسین صابری چشتی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:- "تاریخ ۱۳ رجب بعد گزرنے ۳۰ سال عام الفیل روز جمعہ وقت چاشت اور دس سال چھ دن پہلے بعثت رسول خدا سے، خانہ کعبہ میں آپ پیدا ہوئے۔" (آئینہ تصوف ص ۹ مطبوعہ رام پور سنہ ۱۳۱۲ھ)

(۱۵) مولوی عبید اللہ بسمل امرتسری رقم طراز ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب ام المومنین خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے شادی کے تین برس بعد آپ عین خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سن مبارک اٹھائیس برس کا تھا۔ (ارح المطالب ص ۲۶۶ مطبوعہ نول کشور لاہور)

(۱۶) مولوی عبد الحمید خاں دہلوی سیر الخلفاء میں تحریر فرماتے ہیں:- "طبقاً ابن سعد اور اسد الغابہ میں ہے کہ حضرت علیؑ مکہ مکرمہ میں بروز جمعہ ۱۳ رجب سنہ عام الفیل میں پیدا ہوئے اور آپ سے پہلے خاص بیت اللہ کی چار دیواری کے اندر کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔" (رسالہ مولوی دہلی جلد ۲ نمبر ۱۲، شعبان ۱۳۳۵ھ)
مذکورہ علمائے اہل سنت کی کتابوں اور عبارتوں سے یہ ثابت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے، ان سے پہلے کوئی دوسرا شخص خانہ کعبہ کے حدود میں نہ پیدا ہوا ہے نہ قیامت تک ہوگا۔

مولانا ندوی نے اپنی فریب کاری سے اس مسلمہ تاریخی حقیقت کے تابندہ نقوش کو معدوم اور مسموم کرنے کی جو کوشش فرمائی ہے وہ نہ اہل علم کے نزدیک

میرے نزدیک حضرت علی خانہ کعبہ میں پیدا ہو کر مشرت نہیں ہوئے
بلکہ خانہ کعبہ کو اللہ نے علیؑ کی جائے ولادت قرار دے کر اسے مزید شرف بخشا
ہے۔

ان تمام ناقابل تردید شواہد کی موجودگی میں نہ حکیم بن حزام کا من گڑھت
اور فرضی افسانہ کوئی حقیقت رکھتا ہے نہ مولانا ابوالحسن ندوی کی بچکانی تحریر
کی کوئی اہمیت ہے۔

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711
MAIL : devjani@netcourrier.com

مات شافعی و لیس یدری علی ربہ امر ربہ اللہ
(شافعی مرگیا مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ اس کا رب علیؑ ہے یا اللہ ہے)
اس کا مطلب سمجھنے کے لیے اللہ اور رب کے معنوی فرق کو ذہن میں رکھنا
ضروری ہے۔ یہاں علیؑ کو اللہ کہنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ
آیا اللہ تعالیٰ اپنا کار راست خود چلاتا ہے یا علیؑ کو اپنا ہاتھ، اپنا چہرہ، اپنی آنکھ
اپنی زبان اپنا نفس اور اپنی آیت کہہ کر ان کے ذریعہ چلاتا ہے جس طرح کہ اس
نے عالمان قضا و قدر مقرر فرمائے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:-

صاحب ذوالفقار است تائب کردگار است
(علیؑ صاحب ذوالفقار ہے، اور علیؑ اللہ کا تائب ہے۔)
حضرت شمس تبریز فرماتے ہیں:-

بود با جملہ انبیاء و در سیر بود با مصطفیٰ نبی جہرا
(حضرت علیؑ ہر نبی کی خفیہ طور پر مدد کرتے رہے لیکن محمد مصطفیٰؐ کیلئے کھل کر ظاہر بہ ظاہر آگئے)
تاریخ گواہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی سخت مرحلہ
درپیش آیا تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا:- نَادِ عَلِيًّا مَظْهَرُ الْعَجَائِبِ الخ
اے رسول مدد کے لیے علیؑ کو آواز دو جو عجائبات کا مظہر ہے اور تم ہر موقع پر
اسے اپنا مددگار پاؤ گے۔

حضرت علیؑ کے ان الوہیانہ صفات اور محیر العقول کمالات سے یہ عقدہ کھلتا
ہے کہ ایسی بر فضیلت اور فخر روزگار ہستی کی ولادت کے لیے خانہ کعبہ کا قیام اور
تعمیر ضروری تھی جو حضرت آدم، حضرت ابراہیم اور ملائکہ مقربین کے ہاتھوں اس
لیے عمل میں لائی گئی تاکہ آپ کی ولادت کا شرف اسے حاصل ہو سکے۔

پیدائش واقعہ فیل کے تیرہ برس بعد ہوئی۔ حضرت عمر کا قول ہے کہ میں واقعہ فجار عظمیٰ کے چار سال پہلے پیدا ہوا۔ (واللہ اعلم)

حضرت عمر کی تاریخ پیدائش کا ظہور میں نہ آنا اس بات کی دلیل ہے ان کی خاندانی حیثیت یا ذاتی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ ابتدائی دور کے مورخین ان کی طرف متوجہ ہوتے۔

نام، کنیت اور القاب

حضرت عمر کی اختلافی شخصیت کی طرح ان کے نام میں اختلاف ہے۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ پہلے آپ کا نام یہودیوں کے نام کی طرح غیر تھا، بعد میں اپنی ہیئت بدل کر عمر ہو گیا۔ کنیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ابو حفص یا ابو حفصہ تھی۔ لقب فاروق عظمیٰ مشہور ہے، مگر معلوم نہیں کیوں؟ جب کہ آنحضرت نے یہ لقب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو مرحمت فرمایا تھا اور تمام مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا کہ میرے بعد اسلام میں فتنہ و فساد برپا ہوگا اور جب یہ وقت آئے تو تم علی کا ساتھ دینا اور ان کی پیروی کرنا کیونکہ وہی حق و باطل کے درمیان فاروق ہیں (کنز العمال ج ۴ ص ۱۵۵) اسی صفحہ پر یہ بھی تحریر ہے کہ علیؑ مجھ پر سب سے پہلے ایمان لائے، علیؑ ہی سب سے پہلے مجھ سے مصافحہ کریں گے۔ علیؑ ہی جملہ مومنین کے سردار ہیں اور علیؑ ہی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہیں۔

ریاض النضرہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ میں نے سنا ہے کہ آنحضرتؐ علیؑ سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ تم ہی صدیق اکبر اور تم ہی فاروق اعظم ہو۔ (ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۵۵)

شاہ عبدالعزیز محدث کا کہنا ہے کہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی کنیت ابوتراب، ابو الریحانیتیں اور القاب

باب الثالث حضرت عمر بن الخطاب

خدا کی قدرت کہ ابن حنفیہ ابن حنفیہ سے عمر ہوا

اور پھر، عمر اسے عمر بنیا، بن گیا

(ازالہ الخفا ص ۱۵۸)

پیدائش

تاریخ کی کتابوں میں حضرت ابو بکر کی طرح، حضرت عمر کی تاریخ پیدائش کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔ عمر نواز علماء کا صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ طلوع آفتاب رسالت سے ستائیس برس قبل اور ہجرت نبوی سے چالیس سال قبل کفر کی تاریکی میں کفار مکہ کی ایک شاخ بنی عدی سے تعلق رکھنے والے ایک لکڑہارے خطاب بن نوفل کے یہاں پیدا ہوئے۔ علامہ شبلی بھی حضرت عمر کی تاریخ پیدائش بتانے سے قاصر ہیں اور بڑی تحقیق و جستجو کے بعد صرف اتنا ہی تحریر کر سکے کہ ”حافظ عساکر نے تاریخ دمشق میں عمرو بن عاص کی زبانی ایک روایت نقل کی ہے کہ میں اپنے چند اصحاب کے ساتھ ایک جلسہ میں بیٹھا تھا کہ دفعتاً ایک شور اٹھا، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خطاب کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے“ (الفاروق ص ۲۷-۲۸)

ترجمہ اسد الغابہ ج ۲ ص ۷۲ میں ابن اثیر کے حوالے سے ہے کہ حضرت عمر کی

ذوالقرنین، یعسوب الدین، یعسوب قریش، امین، ہادی، ہمدی، سابق، یعسوب الامۃ
یعسوب المؤمنین، صدیق اور فاروق تجویز فرمائے تھے۔ ان سب کی روایتیں موجود اور
ثابت ہیں۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۲ ص ۲۱۱)

تاریخ الامم والملوک میں ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں بندہ خدا، رسول کا
بھائی اور صدیق اعظم اور فاروق اعظم ہوں۔ میرے سوا اگر کوئی دوسرا اپنے کو صدیق
یا فاروق کہتا ہے تو وہ جھوٹا ہے (تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱)

حلیہ

حضرت عمرؓ کے حقیقی جاں نثار اور پرستار مولوی عبدالشکور پٹاناوالی (لکھنؤ) نے
اپنی کتاب خلفائے راشدین میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ کا رنگ سفید سرخی مائل
تھا۔ زمانہ قحط میں ناموافق غذا کے استعمال سے کالا ہو گیا تھا، رخساروں پر گوشت
بہت کم تھا۔ قد اتنا لمبا تھا کہ جب لوگوں کے درمیان کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا
کہ جیسے کسی سواری پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ (خلفائے راشدین ص ۵۲) مولوی میح الدین
کا کوروی نے تحریر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ بھیگنا (احول) دیکھتے تھے۔ (تاریخ خلفاء ص ۴۳)
علامہ حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ، لائے ڈیل ڈول والے اور گنبھے تھے۔ جسم پر سرخ
رنگ کے بالوں کی کثرت تھی۔ مونچھیں لمبی تھیں جن کے دونوں کناروں پر سرخی نمایاں رہتی تھی
دونوں رخسار پگھلے ہوئے اور اندر کو دھنسے تھے۔

یعقوب بن سفیان نے اپنی تاریخ میں سند جید سے جو زہر بن حبش تک پہنچتی ہے
یہ روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا ہے وہ بامیں تھے، گنبھے اور سیاہ فام تھے اور
اس قدر لمبے تھے کہ معلوم ہوتا کسی جانور پر بیٹھے ہیں۔ ترجمہ اسد الغابہ میں سماک سے
روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی صورت قبیلہ بنی سدوس کے لوگوں سے ملتی تھی اور جب وہ چلتے

تو ایسا لگتا کہ سواری پر ہیں۔ دارطھی اتنی گھنی اور لمبی تھی کہ جب آپؐ چولھا پھونکتے تھے تو
دھواں دارطھی کے درمیان سے خارج ہوتا تھا (خلاصہ عبادت ترجمہ اسد الغابہ ص ۹۲ تا
۱۰۶) اصابع میں بلال ابن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کو میں نے دیکھا ہے وہ ایسے
ڈیل ڈول والے تھے گویا قبیلہ بنی سدوس سے ہوں۔ علامہ ابن عبدالبر کا کہنا ہے کہ
حضرت عمرؓ کا قد طویل اور رنگ سیاہی مائل تھا، سر گنجا، مونچھیں لمبی اور دارطھی جھاری
تھی۔ پیروں سے معقل تھے، ایسا لگتا کہ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ باتیں ہاتھ سے کام کاج
کرتے اور اسی سے کھانا کھاتے۔ رنگ کے بارے میں آپؐ کی اولادوں کا کہنا تھا کہ یہاں
ہم لوگوں کو نانہال سے وراثت میں ملی ہے (الاستیعاب ج ۲ ص ۵)

نانہالی وراثت کی بنا پر حضرت عمرؓ کا سیاہ فام ہونا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ آپؐ
کی ماں حبش تھیں۔ بعض مؤرخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ زمانہ قحط میں گھی اور گوشت کا استعمال
ترک کر دینے سے آپؐ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ یہ تاویل اس لیے قابل قبول نہیں ہے کہ
عرب کی آب و ہوا میں یہ تاثیر نہیں پائی جاتی کہ گھی اور گوشت کا استعمال نہ کرنے والا
انسان سیاہ فام ہو جائے۔ آج بھی عرب میں ہزاروں لاکھوں لوگ گھی کے بجائے صحت
روغن زیتون پر اکتفا کرتے ہیں اس کے باوجود وہ لوگ سرخ و سفید نظر آتے ہیں میرے
خیال میں حضرت عمرؓ کا زمانہ قحط میں گھی کے بجائے روغن زیتون کھا کر سیاہ ہو جانے کی
داستان کو آپؐ کے نانہالی عیب کو پوشیدہ رکھنے کی غرض سے وضع کیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ کے پیروں کا معقل ہونا یا ان کی ایڑیوں کے ملے ہونے کا سبب بھی پیدا
اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی بھی ایک تاریخ ہے اور وہ یہ ہے کہ خالد بن ولید نے
موصوف کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ خالد بن ولید اور حضرت عمرؓ جب یمن کی
سرحدوں میں تھے تو ایک دن کسی بات پر دونوں آپس میں لڑ پڑے۔ خالدؓ نے (جو حضرت
عمرؓ کے خالہ زاد بھائی بھی تھے) حضرت عمرؓ کو پٹک دیا اور نہ جانے کون سا دوا استعمال

ہے کہ اس ہشام کی بیٹی تھیں جو ابو جہل کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس طرح ابو جہل ہشام کا ماموں قرار پاتا ہے۔ (ترجمہ اسد الغابہ، ص ۷۳) علامہ حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کا نانا ہاشم بن مغیرہ تھا جو قبیلہ بنی مخزوم سے تھا۔

ان اختلافات کے درمیان یہ فیصلہ دشوار ہے کہ ہنتمہ دراصل کس کی بیٹی تھی یا اس کا نسلی تعلق اگر عرب سے تھا تو اس کا حقیقی باپ کون تھا؟ ہشام یا ہاشم؟ اور ابو جہل حضرت عمر کا کون تھا؟ ماموں یا کچھ اور؟ چونکہ نسب عرب کی کتابیں ناپید ہیں اس لیے یہ تحقیق محال ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ کس نے کس کی کوکھ سے جنم لیا اور کس کے ساتھ کون بیاہی گئی۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس دور میں حبش کی لڑکیاں بکثرت عرب کے بازاروں میں فروخت ہونے کے لیے آتی تھیں اور لوگ انھیں خرید کر اپنی بیٹی یا بیوی بنالیا کرتے تھے۔ اس لیے حضرت عمر کی ماں کا حبش ہونا یا حضرت عمر کے فرزند کا یہ کہنا کہ سیاہی ہم لوگوں کو ناہنہال سے وراثت میں ملی ہے بعید از قیاس ہرگز نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے ہٹ کر ہنتمہ کے بارے میں ابن قتیبہ کا یہ کہنا ہے کہ ”حضرت عبد المطلب نے ہنتمہ نام کی ایک کنیز خریدی تھی جو جنگلوں میں بکریاں چرایا کرتی تھی نوفل نامی ایک نوجوان نے اس کنیز سے ناجائز تعلق پیدا کیا اور اس کے ساتھ زنا کا مرتکب ہوا اور وہ اکثر وہ جنگلوں میں جا کر اس کی عصمت دری کرتا رہا جس سے ایک لڑکا خطاب نامی پیدا ہوا اور جب وہ جوان ہوا تو اس نے اپنی ماں (ہنتمہ) کو اپنے تصرف میں لے لیا جس سے حضرت عمر پیدا ہوئے۔

ابن حجاج بغدادی اپنی کتاب لسان الواعظین میں لکھتے ہیں کہ ”جناب عبد المطلب کی ایک کنیز حبشیہ کا نام منیہ تھا وہ بلا کی چلیلی اور شہوت پرست تھی اس لیے اکثر وہ بے احتیاطی کی مرتکب ہو جایا کرتی تھی۔ ایسی شہوت پرست عورت

کیا کہ آپ کی نائک ہی ٹوٹ گئی بعد میں علاج سے وہ جڑا تو گئی لیکن عیب باقی رہ گیا۔ چنانچہ خالد بن ولید اور حضرت عمر کے درمیان عداوت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی، جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو انھوں نے خالد بن ولید کو یہ کہہ کر معزول کر دیا کہ خالد میری زندگی میں کسی عہدہ پر نہیں رہ سکتے۔ (خلاصہ عبارت سیرت حلبیہ ص ۱۹۸ ج ۳)

والدین اور نسب

حضرت عمر کے باپ خطاب ابن نوفل تھے جو کفار مکہ کی شاخ بنی عدی سے تھے۔ ان کی ماں ہنتمہ جنھیں عام طور پر ہشام بن مغیرہ کی بیٹی کہا جاتا ہے۔ نسلی اعتبار سے حبش تھیں۔ (مروج الذهب بر حاشیہ کا ص ۷۵ ص ۱۰۹ مطبوعہ مصر) سعودی کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر کی ماں ہنتمہ کا نسلی تعلق عرب سے نہیں تھا بلکہ وہ حبشی نسل کی ایک سیاہ فام عورت تھیں۔ لہذا ایسی صورت میں ہشام بن مغیرہ کی بیٹی کیوں کہہ سکتے ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ہشام نے کوئی حبش لڑکی کہیں پائی ہو اور وہ اٹھا کر اپنے گھر لائے ہوں اور اس کی پرورش کی ہو۔ اسی بنا پر اہل عرب نے اسے ہشام کی بیٹی تسلیم کر لیا ہو کیونکہ اس زمانے میں عربوں میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کی پرورش کرتا تھا تو وہ اسی کی اولاد کہی جاتی تھی جیسے کہ زید کو آنحضرتؐ نے پالا تھا اس لیے لوگ انھیں زید بن محمد کہنے لگے تھے۔

اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ درحقیقت حضرت عمر کا نانا کون تھا؟ علامہ شبلی نے ہشام بن مغیرہ بتایا ہے جبکہ ابن اثیر نے اپنی کتاب میں ”ہنتمہ بنت ہاشم بن مغیرہ“ لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی کی تحقیق کے مطابق ہنتمہ ابو جہل کی چچا زاد بہن ہوتی ہے اور ابن اثیر کے مطابق ابو جہل کی حقیقی بہن قرار پاتی ہے۔ اسد الغابہ میں ابن منذہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر کی ماں ابو جہل کی حقیقی بہن تھیں اور ابو نعیم سے روایت

نسبی رشتہ سے زید حضرت عمر کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور چچا بھی اور خاندان فہم کی وہ عورت حضرت عمر کی دادی بھی تھی اور چچی بھی اور عمرو اپنے باپ نوفل کے بیٹے بھی تھے اور ہم زلف بھی اور نوفل اس عورت کے شوہر بھی تھے اور سسر بھی، اور وہ عورت عمر کے باپ خطاب کی ماں بھی تھی اور بھابھ بھی۔ غرض کہ نہ جانے کون کون سے رشتے پیدا ہو گئے

اس تاریخی تجزیہ سے نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمر صلی اللہ علیہ وسلم صحیح النسب نہیں تھے۔ غالباً ہی سبب تھا کہ حضرت عمر کسی خاندانی یا نسلی تذکرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ علامہ ابن ابی الحدید نے ابو عثمان سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر کو اپنے دور خلافت میں جب یہ معلوم ہوا کہ اشعار کے راویوں اور حالات سے واقف کار لوگوں میں کچھ لوگ ماضی کے نسبی عیسوں کو بیان کرتے ہیں اور گڑے مردے اکھاڑتے ہیں تو آپ منبر پر گئے اور فرمایا کہ خبردار نسب کے عیسوں اور آباء و اجداد کی اصلیت پر بحث نہ کیا کرو کیونکہ اگر آج یہاں میں یہ حکم دوں کہ ان دروازوں سے اس شخص کے علاوہ کو جسے عیوب سے پاک ہو، کوئی نہ نکلے تو مجھے یقین ہے کہ تم میں سے کوئی بھی نکل کر باہر نہ جاسکے گا۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۲۴ مطبوعہ مصر)

ابتدائی حالات

حضرت عمر کی ابتدائی زندگی کے حالات تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ اگر تاریخ کے آئینہ میں آپ کی ابتدائی زندگی کے عکس پر نگاہ ڈالی جائے تو آپ صرت ضحان کے میدان میں اونٹ چراتے، جنگلوں اور پہاڑوں سے لکڑیاں کاٹ کر گلی گلی بیچتے ہوئے عکاظ کے میلوں اور دنگلوں میں لنگوٹ باندھ کر کشتیاں لڑتے ہوئے اور شراب خوری کے ساتھ عرب کی حسیناؤں سے عشق فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کی نگارنی مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کو چرمی پانجامہ پہنا کر قفل لگا دیا جاتا تھا تاکہ پانجامہ نہ کھل سکے اور نہ اس سے کوئی فعل بد سرزد ہو سکے۔ اس کا کام جنگلوں میں اونٹوں کا چرانا تھا۔ ایک دن وہ جنگل میں اونٹ چرا رہی تھی کہ حضرت عمر کے دادا نوفل سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف نے بھی ضحاکہ کی سی طبیعت پائی تھی چلبلی حبش پر نظر جو بڑی تو طبیعت بے قابو ہو گئی۔ اپنی تہہ بند کو اتار کر درخت میں لٹکایا اور آہستہ آہستہ اس کا پانجامہ کھولا اور جی بھر کے منہ کا لالیا جس سے حضرت عمر کے باپ خطاب پیدا ہوئے جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو جوانی کے غیر شائستہ جذبات نے انھیں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ضحاکہ من ہونے کے باوجود نوخیز نوجوانوں کو اپنے نفسانی خواہشات کا نشانہ بنایا کرتی تھی۔ چنانچہ بڑھاپے میں طوفان خیر نفسانی جذبات نے اپنے بیٹے خطاب ہی کو تکمیل ذوق کا نشانہ بنایا اور اس سے اپنی ہوس پوری کی اس طرح حنتمہ عالم وجود میں آئی۔ اس نے بھی اپنی ماں جیسی طبیعت پائی تھی جب جوان ہوئی تو خطاب نے اسے بھی نہ چھوڑا اور اس کے ساتھ وصل کی لذتوں سے لطف اندوز ہوئے اور انھیں لذتوں کا نتیجہ حضرت عمر بنیں۔ (رسالہ شرح کنز مکشوم ص ۵۰-۵۱ مطبوعہ ۱۳۵۰ھ)

ابن حجاج کے اس بیان کے تحت حضرت عمر کی والدہ حنتمہ اور باپ خطاب کے درمیان تین طرح کے رشتے تھے۔ پہلا رشتہ باپ اور بیٹی کا تھا، دوسرا بھائی بہن کا اور تیسرا رشتہ بیوی اور شوہر کا تھا۔

ابن قتیبہ دینوری کا کہنا ہے کہ ۱۔ ”خاندان فہم کی ایک عورت حضرت عمر کے دادا نوفل کے تصرف میں تھی اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے یعنی حضرت عمر کے چچا عمرو نے اس عورت کو اپنے تصرف میں لے لیا جس سے زید پیدا ہوا، اس طرح زید بن عمرو کی ماں خطاب کی بھی ماں تھیں اور زید سعید کے باپ تھے۔

(معارف مطبوعہ مصر ص ۳۷)

علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ سین رشد کو پہنچ کر ان کے باپ خطاب نے جو خدمت ان کے سپرد کی وہ اونٹ چرانے کا تھا۔ خطاب ان کے ساتھ نہایت بے رحمی کا سلوک کرتے، تمام دن ان سے اونٹ چرانے کا کام لیتے اور جب یہ تھک کر دم لینا چاہتے تو انھیں سزا دیتے۔ جس میدان میں حضرت عمر کو یہ خدمت انجام دینا پڑتی اس کا نام ضحمان تھا جو مکہ سے مقام قدید دس میل کے فاصلے پر تھا۔ زمانہ خلافت میں حضرت عمر کا ایک بار ادھر سے گزر ہوا تو آپ کو نہایت عبرت ہوئی اور آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اللہ اکبر ایک زمانہ تھا کہ میں یہاں مذے کا ایک کرتا پہنے ہوئے اونٹ چرایا کرتا تھا اور جب تھک کر بیٹھ جاتا تو باپ کے ہاتھ کی مار کھاتا۔

(الفاروق ۲۷-۲۸)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ بچپن میں لوگ حضرت عمر کو ان کی ماں کی نسبت سے عکاظ کے میلوں اور بازاروں میں حنتمہ والی کہہ کر پکارتے تھے، حتیٰ کہ عورتیں بھی اسی نام سے پکارتی تھیں۔ مسماۃ خولہ کا قول تھا کہ خدا کی قدرت ہے کہ ابن حنتمہ، ابن حنتمہ سے عمرا ہوا اور پھر عمرا سے عمر بن گیا (ازالۃ الخفاء ص ۱۵۸) شاہ صاحب کے اس بیان سے دو باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اول یہ کہ حضرت

لہ عکاظ اس مقام کا نام ہے جہاں زمانہ جاہلیت میں ہر سال ایک میل لگتا تھا۔ چونکہ اس میلے میں زیادہ تر کھالوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اس لیے چڑے کی نسبت سے اس کا نام عکاظ ہوا۔ اس میلے میں شعرو سمن کی محفلیں بھی جمتی تھیں اور عرب کے شعراء قابل ذکر کارناموں کو نظم کے عوام سے خراج تحسین لیتے تھے۔ دنگلوں کا بھی اہتمام ہوتا تھا جس میں لوگ کشتی بازی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اسلام کے بعد حج کے اجتماع نے اس بازار کو سرزد کر دیا۔

عمر کو ماں کی طرف منسوب کر کے پکارا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ لوگ ان کی ولایت سے مطمئن نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ عورتیں آپ کا شمار صنف نازک میں کرتی تھیں۔ شاہ صاحب نے ایک اور دلچسپ وضاحت فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ عمرو عاص حضرت عمر کی نسبی فضیلت کے قائل نہیں تھے اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خدا لعنت کرے اس دن پر کہ جس دن میں حضرت عمر کی طرف سے حاکم بنوں۔ خدا کی قسم میں نے انھیں اور ان کے باپ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ بجز قطران کی ایک چادر کے کوئی دوسرا کپڑا ان کے تن پر نہیں رہتا تھا اور وہ جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر اسے گلی گلی بیچا کرتے تھے۔ (ازالۃ الخفاء مقصد دوم ص ۱۸۳)

اس کا مقصد یہ ہوا کہ حضرت عمر اور ان کے باپ عمرو عاص کی نظر میں بھی انتہائی پست اور کمتر تھے۔ جبکہ خود عمرو عاص کی ماں نابغہ عرب کی ایک مشہور طوائف تھی اور اجرت پر او بانش و بد قماش لوگوں کے خلوت کدے آباد کیا کرتی تھی۔ اس کے مکان پر رایت زنا لہرایا کرتا تھا۔ چنانچہ عمر جب پیدا ہوا تو ابو لہب، امیر، ہشام بن مغیرہ (حضرت عمر کے نانا)، عاص بن وائل اور ابوسفیان نے عمرو کے باپ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ معاملہ یوں طے ہوا کہ عمرو کی ماں (نابغہ) نے ان پانچوں میں سے درمیان یہ تجویز رکھی کہ عمرو کی صورت جس سے مل جائے اسی کا بیٹا تسلیم کر لیا جائے چنانچہ اس کی صورت عاص سے مل گئی اور وہ اسی کا بیٹا مان لیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جب عمرو بن عاص ایسے شخص کی نظر میں حضرت عمر اور ان کے باپ خطاب کی یہ منزلت تھی تو عرب کے شرفار میں ان کا کیا مقام رہا ہوگا۔

لہ قطران ایک بہت ہی معمولی قسم کا پٹرا ہوتا تھا جو گھوڑوں اور اونٹوں کا جامہ بنانے کے کام آتا تھا۔

علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ: ”آغاز شباب میں حضرت عمران شریفانہ مشغولوں میں مشغول ہوئے جو عرب کے شرفاء میں معمول تھے“ (الفاروق ص ۲۸)

زمانہ جاہلیت اور کفر کی تاریکی میں پر دان چڑھنے والے عرب کے بدو، ان جاہل بدوں میں شرفاء اور ان شرفاء میں شریفانہ مشغلے ایسی عجیب و غریب بات ہے جسے عقل قبول نہیں کرتی۔ ممکن ہے علامہ شبلی کا یہ اشارہ حضرت عمر کی اس مخصوص شریفانہ عادت کی طرف ہو جسے کے رازدار صرف اطلاع تھے۔

تعلیم، رنگین مزاجی، پہلوانی اور شراب نوشی

تعلیم کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ حضرت عمر اپنے ماموں علامہ ابو جہل کے شاگرد تھے۔ کیونکہ آپ کے مدبرانہ کارناموں میں بھی جہل نمایاں ہے آپ کی رنگین مزاجی کی داستانیں بھی تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں جن کی وضاحت آگے ہوگی۔ مکہ کے دوسرے نوجوانوں کی طرح آپ کو بھی حسنین عرب سے بلا کا شغف رہا ہے۔ آپ بنت رز کے عاشق بھی تھے اور اپنے اس مشغلہ کو آپ نے اپنی آخری سانس تک برقرار رکھا۔

مصر کے مشہور ادیب اور مصنف محمد حسین ہسکین نے کھل کر ان واقعات کا اعتراف کیا ہے چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ”جب حضرت عمر کی جوانی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ رخصت ہو گئی تو (بڑھاپے میں) ان کے دل میں پھر نکاح کی خواہش پیدا ہوئی۔ انھوں نے نوجوانوں سے شادیاں کیں حضرت عمر کی زندگی اگر اور وفا کرتی تو وہ اور بھی شادیاں کرتے۔“ (عمر فاروق اعظم مترجمہ حبیب اشعر ص ۴۷)

حضرت عمر کو پہلوانی اور کشتی بازی کا بھی بے حد شوق تھا، گویا موصوف اپنے

اپنے وقت کے گاماتھے اور میدان جنگ کے علاوہ ہر میدان میں باضابطہ ننگوٹ باندھ کر اپنی پہلوانی اور طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ علامہ شبلی نے آپ کی کشتی بازی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے اور علامہ بلاذری کی کتاب، کتاب الاشراف سے یہ سند یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ عکاظ کے میلوں اور دنگلوں میں کشتیاں لڑتے تھے۔ (الفاروق ص ۲۸)

حضرت عمر بچپن سے شراب کے شوقین تھے۔ اسلام اختیار کرنے کے بعد بھی آپ نے شراب ترک نہیں کی۔ تاریخ میں یہ واقعہ انتہائی عبرت ناک اور قابل فہم ہے کہ ملت مسلمہ کے خلیفہ ہونے کے باوجود آپ نے ماہ رمضان میں شراب کا استعمال کیا اور نشہ کی حالت میں عبدالرحمن بن عوف کو ہڈی سے مارا اور شعر پڑھے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے خدا سے کہہ دو کہ وہ مجھے شراب پینے سے منع کرے اور ہمارا کھانا پانی بند کرے۔ ہم نے آج سے روزہ رکھنا چھوڑ دیا۔ (نور ایمان، ص ۲۶ بحوالہ ربیع الابرار وفتح الباری فی شرح بخاری)

حضرت عمر نے خود بھی اپنی شراب نوشی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔ ”میں اسلام سے کوسوں دور تھا، جاہلیت میں شراب پیتا تھا اور خوب چاؤ سے پیتا تھا۔ ہماری ایک محفل جمی تھی جس میں اکثر نوجوان شریک ہوتے تھے“ (عمر فاروق اعظم مترجمہ حبیب اشعر ص ۲۷)

پیشہ

حضرت عمر کا خاندانی پیشہ دلالی تھا۔ مولوی وحید الزماں کا کہنا ہے کہ آپ بھی زمانہ جاہلیت میں بائع و مشتری کے درمیان دلالی کیا کرتے تھے (انوار اللغز پارہ ۲ ص ۳۳) دلالی کے علاوہ آپ لکڑہارے کا پیشہ بھی اختیار کیے ہوئے تھے اور جنگلوں سے لکڑیاں

حرکت پر آپ کے بہنوئی نے آپ کی وہ خاطر کی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ عرض کہ آپ اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگے اور مجنوں حلیہ میں ارقم کے گھر پہنچے۔ آنحضرتؐ نے عمر کے خطرناک ارادوں کو فوراً بھانپ لیا۔ آپ نے آگے پڑھ کر کلائی پکڑ لی اور فشار دینا شروع کیا۔ مجھ ہی فشار کچھ ایسا تھا کہ آپ کھٹکوں کے بھل زمین پر بیٹھ گئے رسول اللہؐ نے فرمایا اے عمر اب بتا کہ تو کس ارادے سے آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟ فشار کی شدت سے حضرت عمر کو دن میں تارے نظر آنے لگے اور جب یہ یقین ہو گیا کہ اب جان کا بچنا مشکل ہے تو بولے، حضور میں تو اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ عرض رسول اللہؐ ایک طرف حضرت عمر کی کلائی تھا مے فشار دے رہے تھے اور دوسری طرف آپ کی زبان پر اشہد ان لا الہ الا اللہ تھا۔

علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ کو معمولی ترمیم کے ساتھ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

”حضرت عمر کا تائیسواں سال تھا کہ جب عرب میں آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہؐ مبعوث ہوئے اور اسلام کی صدا بلند ہوئی۔ حضرت عمر کے گھرانے میں زید کی زوجہ کی وجہ سے توحید کی آواز بالکل غیر مانوس نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعید اسلام لائے۔ سعید کا نکاح حضرت عمر کی بہن فاطمہ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔ اسی خاندان میں ایک اور شخص نعیم بن عبد اللہؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بے گانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو وہ سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ جو لوگ قبیلہ میں اسلام لاپچکے تھے ان کے سخت دشمن ہو گئے لہذا ان کے خاندان میں ایک کنیز بھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اس کو بے تحاشہ مارتے، اور مارتے مارتے جب تھک جاتے تو کہتے، ذرا دم لے لوں تو پھر مار دوں گا۔

کاٹ کر اسے گلی گلی فروخت کیا کرتے تھے، اونٹوں کا چرانا بھی آپ کا پیشہ تھا، ابن ابی الحدید نے ابو احمد کے مصنفات سے یہ سند یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت عمر ولید بن مغیرہ کے یہاں خدمت گاری پر مامور تھے اور اکثر انھوں نے ولید کے تجارتی قافلہ کے ہمراہ دور دراز کا سفر بھی کیا۔ دوران سفر آپ کا کام اونٹوں کا چرانا ہوتا اور جب قافلہ بغرض تجارت کہیں قیام پذیر ہوتا تو آپ سامان تجارت اپنے سر پر بار کر کے فروخت کنندہ کے ہمراہ پھیرا کیا کرتے تھے۔ (خلاصہ عبارت شرح ابن الحدید ج ۲ ص ۱۴۲)

حضرت عمر کا ڈرامائی اسلام

حضرت عمرؓ نے اسلام کیونکر قبول کیا؟ اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدترین دشمن ابو جہل (جو حضرت عمر کا ماموں بھی تھا) نے کفار مکہ کے ایک اجماع میں یہ اعلان کیا جو شخص محمدؐ کا سر کاٹ کر لائے گا اسے سواونٹ یا چالیس ہزار درہم انعام میں دیے جائیں گے۔ یہ اعلان سن کر حضرت عمر کے دل میں بھی یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس انعام کو حاصل کر کے معاشی بدحالی کو دور کیا جائے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت آپ نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا کہ میں محمدؐ کو قتل کروں گا۔ تلوار لے کر ارقم کی گھر کی طرف جہاں سرکارِ دو عالم قیام فرماتے، روانہ ہوئے۔ راستہ میں کسی نے پوچھا کہ اے عمر! یہ تلوار لے کر کہاں چلے۔ کہا محمدؐ کو قتل کرنے۔ اس شخص نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر کیوں نہیں لیتے۔ تمہارے بہنوئی اور بہن بھی تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سنا تھا کہ غیظ و غضب کا طوفان بہنوئی کے گھر کی طرف طر گیا، اور آپ جا کر ان سے بھر گئے۔ خوب حجم کو مار پیٹ ہوئی۔ بہن نے خلعت کی تو اس بے چاری کے منہ پر ایسا زور دار گھونسہ رسید کیا کہ وہ لہو لہان ہو گئی۔ اس

عمری نوشتہ

حضرت عمر کے منافقانہ اسلام، مشرکانہ زندگی، عقیدہ بت پرستی اور آل محمد سے دشمنی کے واضح ثبوت میں تمام تاریخی شواہد سے قطع نظر، عمر ہی کے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا ایک اہم نوشتہ پیش خدمت ہے۔ اس نوشتہ کے بعد مزید کسی تبصرہ یا ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس خفیہ تحریر کا راز اس وقت کھلا جب سلسلہ سحری میں حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بہتر جاں نثاروں کے ساتھ میدان کربلا میں تین دن کے بھوکے پیاسے شہید کر دیے گئے تو عبداللہ ابن عمر نے یزید کو ایک خط لکھا اور کہا کہ تو نے آل رسول کو شہید کر کے اسلام میں ایک فتنہ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اس خط کے جواب میں یزید نے عبداللہ ابن عمر کو لکھا کہ اے احمق! یہ راہ تو تیرے باپ ہی کی دکھائی ہوئی ہے لہذا حسین کے قتل کا الزام بھی تیرے باپ ہی کے سر جاتا ہے۔ اور اگر اس امر میں مجھے کوئی اختلاف ہے تو تیرے باپ کی تحریر میرے پاس موجود ہے۔

یزید کا یہ خط پہنچا تو عبداللہ ابن عمر عازم دمشق ہوئے اور وہاں پہنچ کر یزید سے گفتگو کی۔ یزید نے عبداللہ سے دریافت کیا کہ کیا تم اپنے باپ کے ہاتھ کی تحریر پہچانتے ہو۔ عبداللہ ابن عمر نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ تب یزید نے ایک صندوق اندر سے منگوا یا اور اس میں سے ایک خط نکال کر عبداللہ ابن عمر کے سامنے رکھا اور پوچھا کہ یہ تمہارے باپ کے ہاتھ کی تحریر ہے یا نہیں۔ عبداللہ نے کہا ہاں میرے باپ کی تحریر ہے اور بے شک اس پر میری بھی میرے باپ عمر بن خطاب کی ہے۔ تب یزید نے کہا کہ اب تو اسے پڑھ لے۔ عبداللہ ابن عمر نے پڑھنا شروع کیا۔ اس خط میں لکھا تھا۔

”اے معاویہ! آگاہ ہو کہ محمد نے حیل، بہانہ اور جادو کے ذریعہ مجھے لات و ہبل

لبینہ کے سوا اور بھی جس جس پر ان کا قابو چلتا اسے زد و کوب کرنے سے باز نہ آتے۔ لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس پر چڑھ جاتا اترتا نہ تھا۔ ان تمام سختیوں پر بھی وہ ایک شخص کو بھی اسلام سے بدل نہ سکے۔ آخر مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ باقی اسلام ہی کا قصہ پاک کر دیں۔ تلوار کمر سے لگائے سیدھے رسول اللہ کی طرف چلے۔ راہ میں نعیم نے کہا خود تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں فوراً پلٹے اور بہن کے گھر پہنچے اور بولے کہ میں سن چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست بردار ہوئے اور جب بہن بچائے آئیں تو ان کی بھی خبر لی یہاں تک کہ ان کا بدن لہو لہان ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رسول اللہ کی طرف روانہ ہوئے اور آستانہ مبارک پر دستک دی۔ اندر قدم رکھا تو رسول اکرم (صلعم) خود بڑھے اور دامن پکڑ کر فرمایا کہ کیوں عمر کس ارادے سے آیا ہے۔ نبوت کی پر رعب آواز نے انہیں کپکپا دیا۔ نہایت خضوع کے ساتھ بولے کہ ایمان لانے حاضر ہوا ہوں۔“

(خلاصہ عبارت الفاروق ص ۳۲-۳۳)

علامہ شبلی نے ”اعلان ابو جہل“ اور ”قتار رسالت“ کے واقعہ کو نظر انداز کیا ہے جو ان کے مسلک کے اعتبار سے ان کے لیے مناسب نہیں تھا۔

کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت عمر جب ولید بن مغیرہ کے تجارتی قافلہ کے ساتھ روم کے سفر پر تھے تو وہاں کے راہبوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اسلام کے توسل سے آپ کو حکومت ملے گی لہذا آپ اس پیشین گوئی کو نظر میں رکھ کر مسلمان ہوئے۔ پیشین گوئی کے اس واقعہ کو طبری نے ج ۲ ص ۲۲۵ میں بیان کیا ہے۔ ازالۃ الخفاء میں بھی ہے۔ مسعودی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہر حال واقعہ کچھ سہمی یہ بات تو اتر سے ثابت ہے کہ حضرت عمر کا اسلام خلوص اور عقیدت سے کو سول دور تھا۔

لکھا اور اس میں آگاہی دی کہ خلفائے علی ابن ابی طالب کے حقوق کو غصب کیا اور اب تو بھی ضلالت و گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔ عنقریب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق اور عاقبت کن لوگوں کے ساتھ ہے۔

جواب میں معاویہ نے محمد بن ابوبکر کو لکھا کہ خلفاء علی کے حقوق سے اچھی طرح آگاہ تھے لیکن تمہارے باپ ابوبکر اور فاروق (عمر) نے باہم اتفاق کر کے علیؑ سے ان کے حق کو چھین لیا، بس تو مجھے کیا نصیحت کرنا ہے جبکہ تیرے باپ بن قحاذ نے ابتداء طور پر اس کی ابتدا کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم سب اس فعل میں تیرے باپ کے ساتھ شریک تھے۔ اگر تیرا باپ عمر کے ساتھ مل کر ایسا فعل زشت نہ کرتا اور وہ علیؑ کا مطیع رہتا تو ہم بھی مطیع رہتے اور خاندان رسالت کی مخالفت نہ کرتے۔ اس صورت میں اسلام اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہتا مگر اسلام کا اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہنا ہم سب لوگوں کو منظور نہ تھا۔ (تاریخ کامل ۷۶ ص ۷۹)

معاویہ کے اس جواب سے حسب ذیل باتوں کی وضاحت ہوتی ہے:

- ۱۔ خلفاء حقوق علیؑ سے اچھی طرح آگاہ تھے۔
- ۲۔ ابوبکر اور عمر نے باہم اتفاق اور سازش کے ذریعہ حقوق علیؑ کو غصب کیا۔
- ۳۔ ابوبکر و عمر کی اس سازش میں معاویہ بھی شریک تھا۔
- ۴۔ اگر خلفاء علیؑ کی مخالفت میں صفت آرہے ہوتے تو اسلام اپنے سچے مرکز پر قائم رہتا۔
- ۵۔ اسلام کا اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہنا معاویہ یا خلفاء کو منظور نہ تھا۔

بت پرستی

کہہ کے بت پرستوں میں حضرت عمر کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ چنانچہ آپ مشرک بہ اسلام ہونے کے بعد بھی انتہائی مستقل مزاجی سے اپنے اس مسلک پر

کی پرستش اور عبادت سے روکا اور محمد کا جادو، موسیٰ کے جادو سے زیادہ کارگر تھا۔ لیکن ہم اپنے سابقہ دین پر قائم ہیں۔ ہمارے دل سے لات و منات وغیرہ کی محبت ہرگز نہیں گئی اور نہ کبھی جائے گی۔ محمدؐ نے جب دنیا سے رحلت کی تو میں نے اپنی تدبیروں کو بروئے کار لاکر اپنے قبیلے کی مدد سے اسلام کی زمین کو روند ڈالا، اور علی کے خلاف چالیس آدمیوں کو جھوٹی گواہی پر مامور کیا کہ محمدؐ فرما گئے تھے کہ خلیفہ قریش سے ہوگا۔ اس طرح خلافت ہم نے علی کے ہاتھ سے چھین لی۔ میں اگرچہ ظاہرہ طور پر پیغمبر کی متابعت کرتا رہا مگر میرا باطن آج بھی وہی ہے جو قبل اسلام تھا۔ اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے اولاد محمدؐ کی ایذا رسانی میں کوئی رعا یا کمی نہیں کی اور جب تک زندہ رہوں گا کوئی کسر اٹھانہ رکھوں گا۔

اے معاویہ! میری یہ نصیحت تجھ کو ہے کہ آل رسولؐ کو جہاں تک ہو سکے دلیل و رسوا اور تباہ و برباد کرنا اور خاندان رسالت میں سے کسی بھی فرد کو زندہ نہ چھوڑنا اور امکانی کوشش اس بات کی کرنا کہ آل رسولؐ کی بھی حالت میں قوت نہ پکڑنے پائیں۔ لیکن خبردار ظاہر میں مسلمان بنے رہنا تاکہ لوگ تجھ پر خروج نہ کر سکیں اور میرے اس خط کو مکمل راز میں رکھنا!

والسلام

عمر بن الخطاب

(خلعت فلا تلثم ص ۲۵۵، انوار النعمانیہ ج ۱ ص ۲۱، نبوت خلافت دوم ص ۱۰۲)

اس عمری نوشتہ کی تمام باتیں واضح ہیں۔ کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا خط

جنگ صفین کی معرکہ آرائی سے کچھ پہلے محمد بن ابوبکر نے ایک خط معاویہ کو

نہی وہ صداقت پر مبنی ہیں۔ انھیں غلط روایتوں میں سے ایک روایت عقد ام کلثوم کی بھی ہے جو حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے عمر کی قربت و قرابت کا رشتہ جوڑنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔

حالانکہ اس جملہ روایت کی تردید میں شیعوں کی طرف سے متعدد رسائل اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو بہ اعتبار دلائل ایسی مستحکم ہیں کہ جن کا جواب ممکن نہیں ہے مثلاً مرزا احمد کامل صاحب کی کتاب نزہۃ اثنا عشری، سید علی انظر صاحب کا رسالہ کنز مکتوم، سید سجاد حسین صاحب کی شرح کنز مکتوم، برکات حسین صاحب سجاده نشین ماربرہ کی کتاب قول موثوق بہ ثبوت عقد ام کلثوم اور عبد الکریم مشاق کی کتاب افسانہ عقد کلثوم وغیرہ۔

ان سب کتابوں میں عقد ام کلثوم کے موضوع پر مسکت اور مدلل بحث موجود ہے مگر اس کے باوجود کچھ نا فہم لوگ ضد کی تفصیل پر بیٹھ کر اس عقد مفروضہ کی خوشی میں جہالت کی شہنائی پر ایک فرسودہ روایت کا گیت الاہتے ہوئے نظر آتے ہیں، جو ان کی بے وقوفی کا بین ثبوت ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی اسی موضوعہ اور بے ہودہ روایت کے زیر اثر خوش فہمی اور خوش فریبی کا شکار نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اصل واقعہ صرف یہ ہے کہ اسماء بنت عمیس اور اجاب جعفر طیار کے عقد میں تھیں۔ اس کے بعد وہ حضرت ابو بکر کے عقد میں آئیں اور ابو بکر کے صلب سے ایک لڑکی ام کلثوم پیدا ہوئی۔ ابو بکر کے بعد اسماء کا عقد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ہوا اور ام کلثوم جو اس وقت اسغوش مادر میں تھیں اپنی ماں کے ہمراہ حضرت علی کی کفالت میں آگئیں۔ اور انھیں کے گھر میں رہنے لگیں۔ جیسا کہ بوارق کے مصنف نے اس واقعہ کو بحوالہ کنز العمال اور استعیاب تحریر فرمایا ہے کہ برام کلثوم دختر ابو بکر بود

قائم رہے۔ بخاری کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے گھر میں مورتیاں نصب تھیں اور لات و میل کے مرقعے آراستہ رہتے تھے جس کی وجہ سے باایمان لوگ ان کے ہاتھ کی کوئی چیز یا کھانا وغیرہ کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ ابن مسعود ان کے گھر میں یہ منظر دیکھ کر بغیر کھانا کھائے ہوئے واپس آئے اور یہی واقعہ ابوالیوب انصاری کے ساتھ پیش آیا۔ (صحیح بخاری پارہ ۲۳ ص ۷۲)

حضرت عمر اور عقد ام کلثوم

کتاب اپنی معینہ ضخامت کی منزل میں پہنچ چکی ہے۔ حضرت عمر کے باقی حالات، عثمانی زندگی کا تاریخی عکس اور مولانا ندوی کی مستحسنہ باتوں کے مسکت جوابات کے لیے الخلفاء حصہ دوم کا مطالعہ فرمائیں جو انشاء اللہ بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے۔ آخر میں حق کی طرف سے باطل کے لعنت زدہ چہرے پر ایک بھرپور طمانچہ اور سہمی تاکہ دوسرے حصہ کی اشاعت تک (پہنچے کا) نشان برقرار رہے۔

مولانا ندوی کا کہنا ہے کہ :-

”حضرت علیؑ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کو حضرت عمرؓ کی زوجیت میں دے دیا تھا اور یہ دلیل ہے کہ وہ کتنی عزت حضرت عمرؓ کی دل میں رکھتے تھے اور ان کا آپس میں کس درجہ ارتباط تھا“

(المرئضی ص ۱۷۶)

حضرت عمرؓ کے خطا کار اور گناہ آلود دامن پر آل رسول کی عداوت اور دشمنی کے جوہر نفاذ اور غیر فانی دھبے ہیں انھیں مٹانے کی کوششیں عہد معاویہ سے مسلسل جاری ہیں اور انھیں غیر اصولی کوششوں کے نتیجے میں لاتعداد بے شمار غلط روایتیں اور باطل حدیثیں عالم وجود میں آئیں جن کی نہ کوئی حقیقت ہے اور

ملاحظہ ہوں۔

(۱) حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے ان کی دختر ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا، حضرت علیؓ نے فرمایا وہ ابھی کم سن ہے۔ پس عمرؓ نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم ایسا نہیں ہے بلکہ آپ مجھ کو رشتہ دینا نہیں چاہتے۔ اگر وہ کم سن ہے تو بھی آپ اس کو میرے پاس بھیج دیں۔ پس حضرت علیؓ نے ام کلثوم کو بلایا اور ایک پوشاک دی اور فرمایا کہ اس کو عمرؓ کے پاس لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ یہ پوشاک کیسی ہے؟ ام کلثوم جب پوشاک لے کر آئیں تو عمرؓ نے ام کلثوم کو بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ ام کلثوم نے کہا کہ میرا بازو چھوڑ دو۔ عمرؓ نے چھوڑ دیا اور کہا کہ کتنی حسین اور کتنی خوبصورت ہے پھر علیؓ نے ام کلثوم کی شادی عمرؓ سے کر دی۔ (ذخائر العقبیٰ ص ۱۶۸)

اس واقعہ کو ابن اسحاق نے عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کیا ہے، ابن اسحاق کے بارے میں بھی قطان نے کہا ہے کہ ”ابن اسحاق“ کذاب ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ ”ابن اسحاق دجال ہے“ سلیمان تمیمی نے کہا ہے کہ ”ابن اسحاق جھوٹا ہے“ دار القطنی نے کہا ہے کہ ناقابل توجہ ہے۔

(۲) عمرؓ نے حضرت علیؓ سے ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ابھی بچی ہے۔ عمرؓ نے کہا کہ میری اس سے شادی کر دیں میں اس کے ذریعہ فضیلت چاہتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں تم اس کو پسند کر کے یہ سمجھ لینا کہ میں نے اس کی شادی تم سے کر دی ہے۔ پس حضرت علیؓ نے اس کو ایک چادر دے کر بھیجا اور کہا کہ اس سے کہنا کہ یہی وہ چادر ہے جسے تم طلب کر رہے تھے۔ ام کلثوم نے جا کر عمرؓ سے یہ بات کہی تو انھوں نے کہا کہ میں نے اسے پسند کر لی اور بے تابانہ ام کلثوم کی پنڈلی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھول دیا۔ ام کلثوم نے کہا کہ اگر تم خلیفہ نہ ہوتے تو اس بدتمیزی پر میں

مادرش اسماء بنت عمیس کے اولاد نہ جعفر طیار بود باز در نکاح ابو بکر آمد عبد الرحمن پس و دختر ام کلثوم نام زائید بعد ازاں بہ نکاح حضرت علی ابن ابی طالب درآمد ام کلثوم ہمراہ مادر آمد بعدہ عمر بن خطاب با ام کلثوم دختر ابو بکر نکاح کرد۔ لیکن حضرت عائشہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کی بہن حضرت علیؓ کے زیر سایہ پروان چڑھے اس لیے جب ام کلثوم کی عمر چار یا پنج برس کی ہو گئی تو انھوں نے خلیفہ وقت حضرت عمرؓ سے رابطہ قائم کیا اور حکومت کی طاقت کا سہارا لے کر عمرؓ کے ذریعہ ام کلثوم کا مطالبہ کیا۔ حضرت علیؓ معاملات کی نزاکت اور سنگینی سے بخبر نہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ام کلثوم کی کمسنی کا معقول عذر پیش کر کے پہلے تو انکار کیا لیکن حکومت کے دباؤ اور عائشہ کی سابقہ طینت کے تحت یہ سوچ کر کہ حضرت عائشہ ابو بکر کی ہمہ صفات بیٹی اور ام کلثوم کی مختلف البطن بہن اور وارث ہیں، ام کلثوم کو ان کی درخواست پر ان کے پاس بھیج دیا۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت عائشہ کے کردار نے اپنی اس کم سن بہن کو بنا سنوار کر، ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کھوسٹ کے پاس اس کی بوالہوسی کا نشانہ بننے کے لیے محل خلافت میں بغیر عقد کے پہنچا دیا حضرت عائشہ کے اس طرز عمل پر پردہ ڈالتے ہوئے ابتدائی دور کے ضمیر فروش محدثین اور مورخین نے اس انسوس ناک اور عبرت انگیز واقعہ کو روایت کا لباس پہنا کر، عقد ام کلثوم پر محمول کر کے عائشہ کی غلطیوں کو مولائے کائنات کی ذات گرامی سے منسوب کر دیا، تاکہ حضرت علیؓ سے عمر کی قرابت بھی ثابت ہو جائے اور حضرت عائشہ پر کوئی الزام بھی نہ آ سکے۔

چونکہ یہ روایت کثرت اور تواتر سے کتابوں میں مرقوم ہوئی ہے اس لیے اس کا تنقیدی جائزہ بھی ضروری ہے اور یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کتابوں کے مصنف کون تھے؟ اور مذکورہ روایت کے راویوں کی حیثیت کیا تھی؟ چند کتابوں کے اقتباسات

عمر کا فیصلہ سنایا۔ علیؑ نے اس کی شادی عمر سے کر دی اس سے ایک لڑکا زید پیدا ہوا۔ (طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۴۶۴)

اس روایت کو ابن سعد نے محمد بن عمر واقدی سے حاصل کیا ہے۔ امام نسائی کا کہنا ہے کہ واقدی کذاب ہے اور بغداد میں اپنی کذب بیانی کی وجہ سے مشہور تھا (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۶) امام بخاری کا کہنا ہے کہ واقدی متروک الحدیث ہے۔ مزہ نے کہا ہے کہ واقدی کوئی چیز نہیں ہے۔ کچھ بن معین نے کہا ہے کہ واقدی ضعیف ہے۔ ابن مدائنی کا قول ہے کہ واقدی کی بیس ہزار حدیثیں بھل اور غلط ہیں۔ امام شافعی کا کہنا ہے کہ واقدی کی تمام کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں۔ ابن سعد نے انس بن عیاض، عمار بن ابی عامر، ابو حصین اور ابو خالد اسماعیل وغیرہ سے بھی روایت کی ہیں۔ میزان الاعتدال میں ان تمام راویوں کو مجہول الحال قرار دیا گیا ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۳۹۵)

اسی طرح ہشام بن سعد بھی راوی ہے جسے نسائی نے ضعیف کہا ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۵۴) اسماعیل بن عبد الرحمن اسدی کو کچھ بن معین نے ضعیف کہا ہے اور لیث نے کاذب قرار دیا ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۱۰) عطاء بن مسلم خراسانی کو بخاری نے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی حدیث سے احتجاج باطل ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۱۹) عبید اللہ بن موسیٰ کو امام احمد بن حنبل نے صاحب خلیفہ کہا ہے اس کی حدیثیں بدترین ہیں (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۰۰) عبد الرحمن بن زید کو امام نسائی نے ضعیف کہا ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۰۵) اسی طرح ابن شہاب زہری کا نا صبی اور دشمن علیؑ ہونا مشہور ہے۔ الغرض یہ واقعہ ایسے ناقابل اعتبار راویوں پر انحصار کرتا ہے جن کی حیثیت علم حلال کے دائرے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

تمھاری ناک توڑ دیتی پھر ام کلثوم واپس گئیں اور عمر ہاجرین کی محفل میں آئے اور کہا کہ مجھے تم لوگ مبارک باد دو، کہا کس لیے، کہا میں نے ام کلثوم بنت علیؑ سے شادی کر لی (استیعاب ج ۲ ص ۴۶۷)

اس کو ابو عمرو نے زبیر بن بکارسے روایت کیا ہے، اور زبیر بن بکارسے متعلق میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۴۰ میں ہے کہ اس کی حدیثیں دروایتیں ناقابل قبول ہیں کیونکہ یہ جھوٹی حدیثیں اور روایتیں وضع کرتا تھا۔

(۳) عمر بن خطاب نے جب حضرت علیؑ سے ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ابھی کم سن اور صغیرہ ہے۔ حضرت عمر کو بتایا گیا کہ علیؑ نے رشتہ دینے سے انکار کیا ہے۔ پس انھوں نے پھر طلب کیا تو حضرت علیؑ نے کہا کہ میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیج دوں گا، اگر وہ تم کو پسند آگئی تو وہ تمھاری بیوی ہوگی۔ علیؑ نے ام کلثوم کو بھیج دیا۔ عمر نے ان کی پند لی کھولی۔ ام کلثوم نے کہا کہ اگر تو خلیفہ نہ ہوتا تو میں تیرے منہ پر تھپڑ مارتی۔ (اصابہ ج ۲ ص ۴۶۲)

اس روایت کو سفیان نے عمر بن دینار سے روایت کیا ہے۔ امام احمد کا کہنا ہے کہ ابن دینار ضعیف ہے اور امام نسائی اور مزہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۸۷)

(۴) عمر بن خطاب نے حضرت علیؑ سے ان کی بیٹی ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا۔ علیؑ نے جواب دیا کہ وہ ابھی کچی ہے۔ عمر نے کہا خدا کی قسم ایسی بات نہیں۔ مگر مجھے علم ہے کہ آپ کے دل میں کیا ہے، پس علیؑ نے حکم دیا اور کچی کو سجایا سنوارا گیا اور ایک چادر اس کو اوڑھائی گئی اور آپ نے کہا کہ جا کر خلیفہ سے کہنا کہ اگر یہ چادر آپ کو پسند آئے تو رکھ لیں ورنہ واپس کر دیں۔ وہ بچی آئی تو عمر نے کہا اللہ تجھ میں برکت کرے تو مجھے پسند ہے۔ پس وہ علیؑ کے پاس واپس گئی اور

(ج) یہ پہلو کس قدر شرمناک ہے کہ ایک اسلامی خلیفہ اور صحابی رسولؐ، غیر شرعی طور پر ایک نامحرم، نابالغ اور کم سن بچی سے دست درازی کرتا ہے۔ اسے اپنے سینے سے چماتا ہے، بازو پکڑ کر کھینچتا ہے، پنڈلی کھولتا ہے اور بوس و کنار کرتا ہے اور وہ بچی اپنی آبرو کو خطرے میں محسوس کر کے یہ کہتی ہے کہ اگر تم خلیفہ نہ ہوتے تو میں تمہاری ناک توڑ دیتی۔

(د) اگر ان روایات کو درست مان لیا جائے تو یہ اعتراف بھی کو ناپڑے گا کہ حضرت عمرؓ نے ساٹھ برس کی عمر میں ایک نامحرم اور نابالغ و کم سن بچی پر مجرمانہ حملہ کیا، اور اگر عمرؓ کی جگہ کوئی دوسرا شخص اس بے حیائی اور بے غرقی کے ساتھ اس جرم کا مرتکب ہوتا تو اس کو عبرت ناک سزا کا سامنا کرنا پڑتا مگر چونکہ خود حاکم وقت نے یہ قدم اٹھایا تھا اس لیے تمام تعزیری کارروائیاں ساکت اور خاموش رہیں۔ ان روایات سے حضرت عمرؓ کا صریحاً ظالم، فاسق و فاجر ہونا ثابت ہے۔

(ه) مذکورہ روایت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ اس نکاح کو صحابہ رسولؐ سے مخفی رکھا گیا۔ ان کو اس عقد کی خبر تک نہ ہوئی اور جب ام کلثوم ناراض ہو کر واپس چلی گئیں تو حضرت عمرؓ نے مبارک باد کا مطالبہ کیا۔ جب صحابہ نے وجہ دریافت کی تو انھوں نے ام کلثوم سے شادی کی خبر دی۔ جلسی نے تو شرافت کے بجائے تک ادھیڑ کر رکھ دیے، یہاں تک لکھ دیا کہ ”حضرت عمرؓ نے مہاجرین کی مجلس میں جا کر یہ کہا کہ مجھے مجامعت کرائیے۔ صحابہ نے پوچھا، کس سے؟ تو آپ نے کہا کہ میں نے ام کلثوم سے شادی کر لی ہے“ (کتاب السیرت ص ۴۶۳)

ان تمام باتوں کے علاوہ اہل سنت والجماعت کے مذاہب اربعہ میں از روئے فقہ اس فرضی عقد کی تردید کر کے اسے باطل قرار دیا گیا ہے۔ اور اس ضمن میں حنفی مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے مطابق دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ نکاح باطل

سبط ابن جوزی اس شرمناک واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے نانا نے کتاب المنتظم میں اس کا ذکر کیا ہے کہ علیؑ نے ام کلثوم کو عمرؓ کے پاس بھیجا تھا کہ وہ انھیں دیکھیں اور عمرؓ نے ان کی پنڈلی کھول دی۔ انھیں ہاتھ سے چھوا۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم یہ بدترین بات ہے۔ اگر یہاں کوئی کنیر بھی ہوتی تو عمرؓ اس سے یہ بدسلوکی نہ کرتے کیونکہ اجنبی عورت کو مس کرنا حرام ہے۔ لہذا یہ بات حضرت عمرؓ کی طرف کیسے منسوب کی جائے۔ اہل سنت کی صحاح ستہ میں اس نکاح کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا حالانکہ یہ کتابیں حضرت عمرؓ کے جھوٹے فضائل اور مناقب سے بھری پڑی ہیں۔ مذکورہ بالا روایات کو اگر تنقید کی نظروں سے دیکھا جائے تو ہر تعلیم یافتہ ذہن حسب ذیل نتائج کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

(الف) حضرت عمرؓ ساٹھ سال کی عمر میں ایک کم سن اور بروایت صبیہ یعنی دودھ پیتی بچی سے عقد کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور حضرت علیؑ عذر پیش کرتے ہیں کہ بچی شادی کے قابل نہیں ہے۔ مگر حضرت عمرؓ اپنی حکومت کے زعم میں حضرت علیؑ کی بات کو جھٹلاتے ہیں اور خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ جو تمہارے دل میں ہے اس سے میں واقف ہوں۔ یہاں قسم کھا کر حضرت علیؑ کی بات کو جھٹلایا جاتا ہے جبکہ مولانا ندوی کی نظر میں دونوں بزرگ ایک دوسرے پر کامل بھروسہ کرتے تھے۔

(ب) اس شادی کی تعجب خیز نوعیت یہ ہے کہ عقد کے لیے نہ کوئی محفل منعقد ہوئی اور نہ اکابرین صحابہ مہاجرین و انصار میں سے کسی کو مدعو کیا گیا، نہ کسی کو خبر ہو سکی۔ بلکہ اصول اور رسم و رواج کے خلاف لڑکی کا باپ اس پر آمادہ ہے کہ میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اگر تم نے پسند کر لی تو وہ تمہاری بیوی ہے (الاحول ولاقع)

اور عاقلہ کا نکاح اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے اور نہ ہی کسی ولی کے لیے جائز ہے کہ وہ بالغہ اور ناکتہ کو کسی شخص سے نکاح پر مجبور کرے۔ لہذا دونوں صورتوں میں نکاح باطل قرار پاتا ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ نکاح کو برسر عام کر دنا کہ حرام و حلال کا فرق معلوم ہو سکے۔ خود حضرت عمر کا قول ہے کہ نکاح کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس کا اعلان کیا جائے۔ حضرت عمر کے دوسرے نکاح بھی برسر عام ہوئے اور کسی صحابی نے بھی چوری چھپے نکاح نہیں کیا۔

ابن سعد کی طبقات اور دیگر کتابوں میں مرقوم ہے کہ ام کلثوم کا مہر چالیس ہزار درہم مقرر ہوا۔ مہر شریعی کی یہ رقم خود حضرت عمر کے اپنے ہی قول کے خلاف ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ حق مہر زیادہ نہ ہو کیونکہ رسول اللہ (صلعم) نے اپنی کسی بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں فرمایا۔ (ازالہ الخفا ج ۲ ص ۱۱۲) شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ ”حق مہر کا بڑھانا خلاف اصول پیغمبر ہے، چونکہ صحیح احادیث میں حق مہر بڑھانے کی مانعت ہے اس لیے حق مہر آسان باندھو۔“

(تحفہ اثنا عشری ص ۵۹۱ فارسی)

مولانا شبلی نعمانی نے بھی اسی حق مہر یعنی چالیس ہزار درہم کا ذکر اپنی کتاب الفاروق کے صفحہ ۵۰ پر کیا ہے جو شریعت اسلامی اور خود اصول عمری کے خلاف ہے کیونکہ حضرت عمر دوسروں کو تو زیادہ مہر سے روکتے تھے اور خود ساٹھ سال کی عمر میں ایک نابالغ اور کم سن دلہن کا چالیس ہزار درہم ہر دینے پر آمادہ ہو گئے۔ زبر بحث روایت سے یہ عقدہ بھی کھلتا ہے کہ ساٹھ میں حضرت عمر سے اس فرضی شادی کے وقت ام کلثوم کی عمر صرف چار یا پانچ سال کی تھی۔ بعض مورخین کے نزدیک صبیہ یعنی دودھ پیتی بچی تھیں یا صغیرہ و نابالغہ تھیں۔ ابن حجر کی صواعق

اور شریعت اسلامیہ کی نفی میں ہے۔ کیونکہ عقد مفروضہ میں ایجاب و قبول واقع نہیں ہوا اور نہ ہی اس میں گواہان مقرر کیے گئے۔ اہل سنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ایجاب و قبول نکاح کا رکن ہے کسی مسلمان کا نکاح بغیر دو عادل آزاد اور بالغ مسلمانوں کی شہادت کے منعقد نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس نکاح میں یہ تمام شرائط مفقود ہیں اس لیے یہ نکاح قطعی باطل اور غیر اسلامی قرار پاتا ہے۔

روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمر کے سخت اور جاہلانہ مطالبہ کے بعد لڑکی کے ولی نے یہ فرمایا کہ میں ام کلثوم کو تمہارے پاس بھیجوں گا اگر تم کو پسند آگئی تو اس کی شادی تم سے کر دوں گا۔ (استیعاب ج ۴ ص ۲۶۷) یا یہ کہا کہ اگر تم نے پسند کر لی تو وہ تمہاری بیوی ہے۔ (استیعاب ج ۴ ص ۲۶۹)

”اگر“ کے لفظ پر منحصر عقد اصطلاح کی زبان میں عقد معلق کہلاتا ہے اور مالکیوں، شافعیوں اور حنبلیوں یا حنفیوں کے نزدیک نکاح معلق باطل ہے۔ نکاح کو منجز ہونا چاہیے۔

روایت سے یہ بات بھی آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ام کلثوم اس وقت کم سن اور نابالغ تھیں۔ نابالغ بچی کی رسم نکاح میں ایک وکیل اور ایک گواہ کا ہونا کافی ہے لیکن حنفی مسلک کے مطابق باب کی موجودگی شرط ہے اگر باپ موجود نہیں ہے تو نکاح جائز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ام کلثوم کی عمر اس نکاح کے وقت دس گیارہ برس کی تھی تو یہ مفروضہ اور بھی خطرناک ہوگا کیونکہ روایتیں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ ام کلثوم سے حضرت عمر کے ساتھ عقد کرنے کی کوئی اجازت لی گئی ہو۔ بلکہ حضرت عمر کی دست درازی کے بعد انھیں بتایا جاتا ہے کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔ (استیعاب ج ۴ ص ۲۶۷) یعنی حضرت عمر کی بدتمیزی سے قبل لڑکی کو کچھ نہیں معلوم۔ جب کہ اہل سنت کے یہاں یہ امر مسلمہ ہے کہ حرمہ، بالغہ

سے اس واقعہ کی تردید ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ”لوگوں نے غلط طور پر یہ وہم کر لیا ہے کہ عمر نے ام کلثوم الکبریٰ بنت امیر المومنین کا رشتہ طلب کیا بلکہ انھوں نے تو ام کلثوم بنت جریول خزانہ سے نکاح کیا تھا۔ (تاریخ قم حسن بن محمد بن حسن نیشاپوری قلمی معاصر شیخ صدوق ص ۱۹۳)

اس مفروضہ روایت کے سلسلے میں سرکار علامہ شیخ مفید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ:-

یہ روایت جو وارد ہوئی ہے کہ جناب امیر المومنین نے اپنی صاحبزادی کی شادی حضرت عمر سے کر دی تھی، بالکل ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا راوی زبیر بن بکاء ہے جس کے لیے مشہور ہے کہ یہ ناقابل اعتماد اور متہم ہے۔ چونکہ یہ حضرت علی کا دشمن تھا اس لیے ان کے خلاف غلط روایتیں وضع کرنا رہتا تھا۔ شیعہ کتابوں میں یہ روایت اس لیے نقل ہو گئی ہے کہ ابو محمد یحییٰ بن حسن علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب میں اس کو لکھ دیا اور لوگوں نے علوی سمجھ کر اس پر اعتماد کر لیا۔ حالانکہ انھوں نے یہ روایت زبیر بن بکاء سے لی ہے اور یہ روایت بہ ذات خود بھی مختلف طریقوں سے نقل ہوئی ہے۔ زبیر بن بکاء کبھی یہ نقل کرتا ہے کہ امیر المومنین نے خود اپنی بیٹی کا نکاح کیا۔ کبھی روایت کرتا ہے کہ عباس کو اس عقد کا متولی بنایا، کبھی کہتا ہے کہ اختیار وایتا پر یہ نکاح ہوا۔ پھر بعض نے اس روایت کو اور آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ حضرت عمر سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام زید ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زید بن عمر لا ولد مر گیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کی بھی اولاد ہے۔ کئی کہتے ہیں کہ یہ اور اس کی ماں دونوں قتل کر دیے گئے، کسی نے کہا کہ ماں بعد میں بھی زندہ رہی کوئی کہتا ہے کہ عمر نے چالیس ہزار درہم حق مہر مقرر کیا، کوئی کہتا ہے کہ چار سو درہم پر نکاح ہوا، کسی نے کہا پانچ سو درہم مہر مقرر ہوا۔ اس قول کی ابتدا اور اس واقعہ

محرقہ میں ہے کہ وہ بہت چھوٹی تھیں ورنہ حضرت علیؑ ان کو عمر کے پاس نہ بھیجتے۔ شہاب الدین دولت آبادی کے نزدیک ان کی عمر پانچ برس کی تھی۔ یاسین موصی نے المہذب ص ۹۸ پر اور عمر رضا کمالہ نے اعلام النساء ص ۲۵۶ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت عمر نے ذیقعد ۳۱ھ میں یہ شادی کی اور شادی کے ایک سال بعد دخول کیا حالانکہ نابالغ بچی سے دخول فعل حرام ہے خواہ وہ منکوحہ ہی کیوں نہ ہو لہذا عمر رضا کمالہ کی نظروں میں حضرت عمر فعل حرام کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنے بیان کے اثبات میں دو شیعہ علماء قاضی نور اللہ شوستری اور ابوالقاسم قمی کی کتابوں کو دلیل قرار دے کر عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی جو سعی فرمائی ہے وہ انتہائی مذموم ہے اور اس سے ان کی تاریخی بددیانتی ظاہر ہوتی ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری شہید ثالث کا بیان اس نکاح کی تردید میں ہے اور ”اگر“ سے مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ بالفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی احتمال خطا کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ حضرت عمر کلمہ گو تھے اور شیخ قمی نے اس واقعہ کو صرف کتابوں میں لکھا ہونا بیان کیا ہے نہ کہ انھوں نے تائید فرمائی ہے۔

میرا یہ مشورہ ہے کہ عام مسلمانوں کو دھوکا دینے کے بجائے ندوی صاحب ایک بار پھر شہید ثالث اور شیخ قمی کی روایتوں پر غور فرمائیں اور اگر آپ کو شیعہ علماء کی تحقیق پر بھروسہ ہے تو ابو محمد بن شاذان بن خلیل نیشاپوری کی تحقیق پر غور فرمائیں۔ جو جلیل القدر فقہا و ثقہ اور متکلمین میں سے ہیں اور آپ امام رضا علیہ السلام، امام محمد تقی علیہ السلام، امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے معتقد صحابی تھے اور اہل سنت نے بھی آپ کو معتد علیہ تسلیم کیا ہے۔

ابو محمد علیہ الرحمہ نے اس عقد کے بارے میں جو تاثرات پیش کیے ہیں ان

تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ ام کلثوم بنت ابوبکر کے علاوہ ام کلثوم نام کی چار بیویاں اور بھی تھیں۔

۱۔ ام کلثوم جلیلہ بنت عاصم بن ثابت، جو عاصم بن عمر کی ماں تھیں۔

(تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۵۱)

۲۔ ام کلثوم بنت جریول خزاعی، ان کا اصل نام ملیکہ تھا۔ یہ زید بن عمرو کی ماں تھیں۔ (کامل ج ۲ ص ۲۲)

۳۔ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط۔

(یہ زمانہ جاہلیت میں عمرو بن عاص کے پاس سے بھاگ کر آئی تھیں اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے قرابت داروں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی دایسی کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ جو عورت اسلام قبول کر لے وہ کسی کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی لہذا واپس نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس سے نکاح کر لیا۔ (تفسیر کبیر ج ۸ اور شرح بخاری قسطلانی ج ۲ ص ۳۲۹)

۴۔ ام کلثوم بنت راہب (سنن ابن ماجہ اور سنن ابی داؤد)

بعض مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ام کلثوم بنت ابوبکر کے لیے حضرت عمر نے حضرت عائشہ کے پاس عقد کا پیغام بھیجا تھا اور وہ راضی ہو گئی تھیں۔ یہ بات مندرجہ ذیل حوالہ جات سے ثابت ہے۔

(۱) تاریخ خمیس، علامہ حسین دیاربکری ج ۲ ص ۲۶۷ (۲) تاریخ کامل ج ۳

ص ۲۱ مطبوعہ مصر (۳) الاستیعاب ج ۲ ص ۹۵ وغیرہ

ان تمام شواہد اور تاریخی تجزیہ کے بعد معمولی عقل کا انسان بھی آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ روایت محض حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی تحقیر کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اس نکاح سے نہ حضرت عمر کی فضیلت میں کوئی

میں اختلاف کی کثرت اصل روایت کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔

(المسائل السروہ ص ۱۶۱ المسئلة العاشرة مطبوعہ نجف اشرف)

اسی طرح شیعہ علمائے کرام کی طرف سے لاتعداد کتابیں اس نکاح کی تردید

میں موجود ہیں جو اس کی روایت مفروضہ کو باطل قرار دیتی ہیں۔ ضروری ہے کہ اس واقعہ کی تاریخی خامیوں کو بھی اجاگر کیا جائے تاکہ اس مسئلہ پر مزید بحث کی گنجائش نہ رہ جائے۔ مورخین کی اکثریت نے اس عقد کو ذیقعد ۳ھ میں ہونا بیان کیا ہے۔ اسی سال حضرت زینب بنت علی علیہ السلام کا عقد عبداللہ بن جعفر سے ہوا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بڑی بیٹی کی موجودگی میں چھوٹی دختر کا نکاح پہلے کیوں کیا گیا؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تاریخ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ام کلثوم اور ان

کے صاحبزادے زید بن عمر میں سال کی تھی کا انتقال ایک ہی وقت میں ہوا، امام حسن نے عبداللہ بن عمر کو نماز جنازہ پڑھنے کو کہا جب کہ ام کلثوم ۳ھ میں وفات

کر بلا کے بعد اسیران کے قافلہ میں شامل تھیں اور عبداللہ بن عمر کا یزیدی حکومت پر اثر و رسوخ بھی تھا۔ یہاں تک کہ جناب مختار کو انھیں عبداللہ ہی کی سفارش پر

رہا کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ اعلانیہ بنی امیہ کے جانی دشمن تھے۔ مگر عبداللہ نے اپنی سوتیلی ماں کی سفارش نہیں کی۔ اگر ام کلثوم عبداللہ کی سوتیلی ماں ہوتیں تو وہ

یقیناً اپنی غیرت اور باپ کی عزت کو بازاروں میں دربر نہ ہونے دیتے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ مورخین کا کہنا ہے کہ عمر کے مرجانے کے بعد ام کلثوم کا عقد ثانی عون بن جعفر سے ہوا۔ حالانکہ شیعہ روایتوں کے مطابق حضرت زینب

اور ام کلثوم کا عقد ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں عبداللہ اور عون پسران جعفر سے ہوا۔ عمر کے مرنے کے بعد بنت ابوبکر کا عقد عون بن جعفر سے اس لیے ناقابل

تسلیم ہے کہ عون حضرت عمر کی زندگی ہی میں جنگ فارس میں کام آچکے تھے۔

کتاب کے نام

(بہ اعتبار حروف ابجدی)

کتابیات	پہچان	کتابیات	پہچان
انوار النعمانیہ	۱۵	قرآن مجید	۱
انوار اللغۃ	۱۶	ہنج البلاغۃ	۲
المہذب (یاسین موصی)	۱۷	احیاء العلوم	۳
اعلام الناس (عمر رضا کمال)	۱۸	ارجح المطالب	۴
المسئلۃ العاشرہ	۱۹	ازالۃ الخفاء	۵
جامع ترمذی	۲۰	اصحاب ثلاثہ	۶
جامع الاصول	۲۱	استیعاب	۷
جہاد حسین	۲۲	اسد الغابہ	۸
چودہ ستارے	۲۳	الفاروقی	۹
در منشور	۲۴	الوافی	۱۰
ہدایت السعداء	۲۵	امہات الامم	۱۱
حیوۃ النحویان	۲۶	الامامت والیاست	۱۲
حبیب السیر	۲۷	اصابہ	۱۳
طبقات ابن سعد	۲۸	انسان العیون فی سیرۃ الامین الامام	۱۴
کنز العمال	۲۹	ملقبہ سیرت	

اضافہ ہوتا ہے اور نہ اسلام کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے بلکہ عمری کردار سیاہ اور اسلامی تعلیمات مکروہ دکھائی دیتی ہیں۔

مولانا ندوی کی عقدا م کلثوم پر مبنی معترضہ تحریر کے اس جواب کے بعد الخلفاء کا حصہ اول تمام ہوا۔ باقی جوابات حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیں اور میری ذاتی درخواست پر میرے والد مرحوم کے لیے ایک سورہ فاتحہ ارسال فرمائیں شکریہ

شیعیت زندہ باد... حنیفیت پائندہ باد... یزیدیت مردہ باد

خادم ملت
فروغ کاظمی

کتابیات	پہچان	کتابیات	پہچان
شفاء (قاضی عیاض الدین)	۸۶	عمدة المطالب	۶۷
شرح زرقانی	۸۷	فتح الباری فی شرح بخاری	۶۸
شواہد النبوة	۸۸	فردوس الاخبار	۶۹
شرح مسلم (نودی)	۸۹	فصول المہمہ	۷۰
تاریخ کامل	۹۰	فتاویٰ عزیزی	۷۱
تاریخ طبری	۹۱	صواعق محرقة	۷۲
تفسیر درمنثور	۹۲	صحیح مسلم	۷۳
تفسیر معالم التنزیل	۹۳	صحیح بخاری	۷۴
تحفة العباد	۹۴	صحیح ترمذی	۷۵
تاریخ الامم والملوک	۹۵	قرة العینین	۷۶
تفسیر کبیر	۹۶	ریاض النضرة	۷۷
تہذیب التہذیب (علامہ ذہبی)	۹۷	روضۃ الانف	۷۸
تہذیب التہذیب (علامہ حجر عسقلانی)	۹۸	روضۃ الصفی	۷۹
تاریخ خمیس	۹۹	روضۃ الاحباب	۸۰
تاریخ احمدی	۱۰۰	روضۃ الشہداء	۸۱
تاریخ ابن اثیر	۱۰۱	ردائع المصطفیٰ	۸۲
تاریخ ابن خلدون	۱۰۲	رسالہ مولوی	۸۳
تاریخ بغداد	۱۰۳	رسالہ کنز کتوم	۸۴
تاریخ عروج وزوال سلطنت روم	۱۰۴	شرح نیج البلاغہ ابن ابی الحدید	۸۵

کتابیات	پہچان	کتابیات	پہچان
کنز العمال	۳۰	نزول الابرار	۴۹
کتاب الفتن	۳۱	نیایع المودة	۵۰
کوکب درسی	۳۲	نور ایمان	۵۱
کتاب البشائر المصطفیٰ	۳۳	نہایہ ابن اسیر	۵۲
کتاب السیرت	۳۴	سیرۃ النبی (علامہ شبلی نعمانی)	۵۳
لغات کشوری	۳۵	سنن ابی داؤد	۵۴
مستدرک حاکم	۳۶	سوانح عمری حضرت ابوبکر	۵۵
مروج الذهب	۳۷	(محمد حنین بیگلر)	
میزان الکبریٰ	۳۸	سوانح عمری حضرت ابوبکر (عبدالرحمن)	۵۶
مدارج النبوة	۳۹	سیرۃ النبی (ابو محمد بن عبد الملک)	۵۷
مند امام حنبل	۴۰	سیرۃ العلویہ	۵۸
مشکوٰۃ شریف	۴۱	سیرۃ محمدیہ	۵۹
مواہب	۴۲	سیرۃ حلبیہ	۶۰
ماہنامہ منادی	۴۳	سر العالمین	۶۱
معارف	۴۴	سیرۃ ابن ہشام	۶۲
مشکوٰۃ المصابیح	۴۵	سیرۃ الخلفاء	۶۳
مطالب السؤل فی مناقب آل رسول	۴۶	سنن ابن ماجہ	۶۴
مفتاح الفتوح	۴۷	عقد الفرید	۶۵
میزان الاعتدال	۴۸	عمر فاروق اعظم (مترجم حبیب اشعر لاجپور)	۶۶

بج	کتابیات	بج	کتابیات
۱۰۵	تاریخ یعقوبی	۱۱۲	تجربہ بخاری
۱۰۶	تاریخ الاعیان	۱۱۳	تذکرہ خواص الامہ
۱۰۷	تاریخ ابوالفدا	۱۱۴	تحفہ اثنا عشری
۱۰۸	تاریخ اسلام	۱۱۵	ثبوت خلافت اول و دوم
۱۰۹	تاریخ قم (حسن بن محمد بن حسن نیشاپوری)	۱۱۶	خلفائے راشدین (مولوی عبدالشکور)
۱۱۰	تاریخ خلفاء (مولوی مسیح الدین کاکری)	۱۱۷	خلافت النبی
۱۱۱	تلخیص سیرۃ النبی	۱۱۸	خصائص نسائی
		۱۱۹	خلعت فلاح

حکیم سید محمود گیلانی کی پیشکش
تحریریں

ایلیا

ہدیہ
دس روپے

ملنے کا پتہ

عباسؑ بک ایجنسی، درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ

شہید
اور
علی

ہدیہ: آٹھ روپے

باسمہ سبحانہ

شہید محراب

آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب شیرازی

دو گراں و تدر تصنیف

استعاذہ
قلب لیم

(اللہ تعالیٰ کے حضور میں
دونوں حصے ایک جلد میں
دستیاب ہیں
ہدیہ: شش روپے)

ملنے کا پتہ

عباسؑ بک ایجنسی

درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ (انڈیا)
فون نمبر: ۲۶۰۷۵۶